DDUR202DCT

شعری اصناف

ڈپلوما اِن اردو

(دوسرا سمسٹر)

پانچواں پرچہ

مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد۔500032، تلنگانہ، بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Sheri Asnaaf
ISBN: 978-81-994387-6-7
First Edition: **October 2025**

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2025
Copies	:	1000
Price	:	175/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Dr. Md Nehal Afroz/Dr. Mohd Jafar, CDOE , MANUU
Cover Designing	:	Dr. Mohd. Akmal Khan, CDOE, MANUU
Printer	:	Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Sheri Asnaaf

Paper V

Diploma in Urdu 2nd Semester

Centre for Distance and Online Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

مدیر

پروفیسر نکہت جہاں
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

معاون مدیر

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس
سابق ڈین اسکول آف لینگویجز و صدر شعبہ اردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس اِدارت

پروفیسر نکہت جہاں
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پروفیسر محمد نسیم الدین فریس
سابق ڈین اسکول آف لینگویجز و صدر شعبہ اردو
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر ارشاد احمد
اسسٹنٹ پروفیسر، اردو
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد نہال افروز
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر محمد جعفر
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی
مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

کورس کو آرڈی نیٹر

پروفیسر نکہت جہاں، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر محمد جعفر، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی 1 ،2، 13
پروفیسر فاطمہ پروین، سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 3، 12
پروفیسر نسیم الدین فریس، سابق صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 4، 11
پروفیسر نکہت جہاں، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی 5 ،16
پروفیسر طلعت جہاں، وائس پرنسپل، شادان پی۔ جی۔ کالج، حیدرآباد	اکائی 6
ڈاکٹر محمد شارب، پی جی ڈیپارٹمنٹ آف لینگویج اینڈ لٹریچر، فقیر موہن یونیورسٹی، اڑیسہ	اکائی 7
ڈاکٹر محمد اکمل، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی 8
ڈاکٹر محمد شاہد، لکچرر، پنڈت دین دیال اپادھیائے ماڈل انٹر کالج، ایٹا، اترپردیش	اکائی 9
ڈاکٹر محمد نہال افروز، مرکز برائے فاصلاتی و آن لائن تعلیم، مانو، حیدرآباد	اکائی 10
ڈاکٹر محمد نسیم، شعبہ اردو، بی۔ این۔ منڈل یونیورسٹی، مدھیہ پورا، بہار	اکائی 14 ،15

فہرست

کورس کا تعارف : کوآرڈی نیٹر		06
بلاک I		
اکائی 1	مثنوی: "سحر البیان" (انتخاب: شہزادہ بے نظیر کا کنویں میں قید ہونا) میر حسن	09
اکائی 2	ثنوی: "زہر عشق" (انتخاب: آغاز داستان) مرزا شوق	20
اکائی 3	قصیدہ: "ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی" ذوق	33
اکائی 4	قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" مرزا غالب	44
بلاک II		
اکائی 5	مرثیہ: "حضرت علی اکبرؑ کی شہادت" میر انیس	61
اکائی 6	مرثیہ: "حضرت علی اصغرؑ کی شہادت" مرزا دبیر	73
اکائی 7	غزل: میر تقی میر، مرزا غالب	83
اکائی 8	غزل: مولانا حالی، علامہ اقبال	99
بلاک III		
اکائی 9	غزل: حسرت موہانی، جگر مراد آبادی	118
اکائی 10	غزل: ناصر کاظمی۔ فراق گورکھپوری	132
اکائی 11	غزل: مغنی تبسم, شہریار	149
اکائی 12	نظم: "بنجارہ نامہ" نظیر اکبر آبادی	167
بلاک IV		
اکائی 13	نظم: "او دیس سے آنے والے بتا" اختر شیرانی	177
اکائی 14	نظم: نیا شوالہ (اقبال) ملاقات (فیض)	188
اکائی 15	نظم: گرمی اور دیہاتی بازار (جوش)، رات اور ریل (مجاز)	203
اکائی 16	رباعیات (انیس، اکبر، جوش، امجد)	218
نمونہ امتحانی پرچہ		231

پیغام

پروفیسر سید عین الحسن
شیخ الجامعہ (مانو)

گزشتہ چند برسوں کے دوران یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ غیر اردوداں طبقے میں اردو سیکھنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں شائقین کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ نئی نسل اردو ادب سے بالخصوص اردو شاعری سے دلچسپی رکھتی ہے۔ آج اردو شاعری کو بہتر انداز سے سمجھنے اور اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے نوجوان اور باذوق لوگ اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔ اردو کی وہ نئی نسل، جس نے انگلش میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے لیکن اردو نہیں جانتی، وہ بھی اردو سیکھنا چاہتی ہے۔ اردو زبان کے شائقین اور اردو سیکھنے کے خواہشمند افراد کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے سینٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن نے "ڈپلوما ان اردو" کا نصاب ترتیب دیا ہے۔ یہ ایک فاصلاتی طرز کا پروگرام ہے جسے اساتذہ نے بہ حسن خوبی انجام دیا ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ CDOE کے معاونین کی انتھک اور مخلصانہ کاوشوں کی بدولت "ڈپلوما ان اردو" کا اکتسابی مواد تیار ہو سکا۔ میں ان سب کو دلی مبارک باد دیتا ہوں، ساتھ ہی اردو سیکھنے کے شائقین کو دعوت دیتا ہوں کہ آیئے مانو کے اس فاصلاتی پروگرام کے ذریعے اردو زبان سیکھیے اور اردو کے اس نصاب کے مدِ نظر اپنے ذوق سلیم کی تربیت کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اکتسابی مواد اردو زبان سیکھنے میں معاون ثابت ہوگا۔ مزید یہ کہ اس حوالے سے آپ نہ صرف اردو زبان سے واقف ہوں گے بلکہ اردو کے علمی، ادبی اور ثقافتی ورثے سے بھی شناسائی حاصل کریں گے جس کی روح ہندوستانی ہے۔

پیغام

پروفیسر محمد رضاء اللہ خاں
ڈائرکٹر CDOE(مانو)

دور حاضر میں فاصلاتی طرز تعلیم کو ساری دنیا میں ایک نہایت کارآمد اور مفید طریقہ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ اس طریقہ تعلیم سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اردو آبادی کی تعلیمی صورتِ حال کے پیش نظر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے اپنے قیام کے روز اول ہی سے اس طرزِ تعلیم کو اپنایا۔ چنانچہ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم (سنٹر فار ڈسٹنس اینڈ آن لائن ایجوکیشن) کے تحت یو.جی، پی.جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکٹ کورسوں پر مبنی جملہ (19) پروگرام نہایت کامیابی سے چلائے جارہے ہیں۔ جن کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ہو رہا ہے۔ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم کے تحت پیش کیا جانے والا نیا تعلیمی پروگرام "ڈپلوما ان اردو" ہے۔ اس کا آغاز اسی سال (2025) سے ہو رہا ہے۔

یہ پروگرام بنیادی طور پر غیر اردو داں طبقے کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا خود اکتسابی مواد تیار کرنے والے ماہرین نے غیر اردو داں طبقے کے ذہن و مزاج اور اکتسابی دشواریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پیش نظر اکتسابی مواد تیار کیا ہے تا کہ غیر اردو داں افراد کو اردو سیکھنے میں دقت نہ ہو اور وہ آسانی سے اردو زبان سیکھ لیں۔ میں اکتسابی میں مواد لکھنے والے اساتذہ اور ماہرین کو صمیم قلب سے مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تدریسی مواد، اردو زبان سیکھنے کے خواہشمند افراد میں اردو کی لسانی مہارتوں (سمجھنا، بولنا، پڑھنا اور لکھنا) کو فروغ دینے میں مددگار ثابت ہو گا۔

کورس کا تعارف

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مانو) ہندوستان کی ایک اہم مرکزی یونیورسٹی ہے جس کا قیام 1998 میں پارلیمنٹ کے ایک خصوصی ایکٹ کے ذریعے عمل میں آیا۔مانو کو ملک کی دیگر جامعات کے مقابلے میں یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہ یونیورسٹی اردو ذریعہ تعلیم (اردو میڈیم) کی یونیورسٹی ہے جو اردو زبان میں روایتی اور فاصلاتی طرز پر اردو آبادی کو اعلیٰ پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم فراہم کر رہی ہے۔اس یونیورسٹی کو جو مینڈیٹ دیا گیا ہے اس کے تحت اس کے قیام کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد اردو زبان کی ترویج وترقی ہے۔

مانو کے تمام روایتی وفاصلاتی طرز کے پروگراموں اور کورسوں میں یہ مقصد زیریں لہر کی طرح کارفرما ہے۔یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ عہد حاضر میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اردو زبان کو ادب کے علاوہ سوشیل سائنس اور سائنس کی مختلف شاخوں، کامرس اور بزنس مینجمنٹ کمپیوٹر سائنس اور انجینئرنگ، قانون اور صحافت جیسے عصری علوم سے جوڑنے میں نہایت طاقتور اور متحرک کردار ادا کر رہی ہے۔اس میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کے شعبوں کے ساتھ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم کے پروگرام بھی برابر کے شریک ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے مرکز برائے فاصلاتی وآن لائن تعلیم کے تحت مختلف شعبہ ہائے علم میں مختلف سطحوں کے متعدد پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جن کے ذریعہ اردو داں طبقے کی ایک بڑی تعداد استفادہ کر رہی ہے۔مانو کے شیخ الجامعہ پروفیسر سید عین الحسن ہمیشہ یونیورسٹی کی ترقی وتوسیع ،تعلیمی معیار کی بلندی اوراردو زبان کے فروغ واستحکام کے لیے نئے نئے منصوبوں پر غور کرتے رہتے ہیں،ان کے ذہن رسانے یہ سوچا کہ اردو زبان کا ایک ایساڈپلوماپروگرام متعارف کراناچاہیے جس کے ذریعے غیر اردو داں افراد کواردو زبان سیکھنے میں سہولت ہواوروہ اردو میں نوشت وخواند کی استعداد کے حامل ہو سکیں و نیز ان میں اردو ادب اوراردو کی گنگا جمنی ثقافت کی اہمیت اور عظمت کا شعور بھی پیدا ہو۔شیخ الجامعہ کی ایما اور پروفیسر محمد رضاء اللہ خاں،ڈائرکٹر مرکز برائے فاصلاتی اورآن لائن تعلیم کی رہنمائی میں اردو کے ایک ڈپلوما پروگرام کا خاکہ تیار کیا گیا۔ماہرین کے مشوروں سے اس کا نصاب ترتیب دیا گیا اور فاصلاتی طرز تعلیم کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرتبہ نصاب کے مطابق اس ڈپلوما پروگرام کا خود اکتسابی مواد اور کتابیں تیار کی گئیں اوراب یونیورسٹی کے ارباب مجاز کی منظوری سے یہ پروگرام جسے ڈپلوما اِن اردو(Diploma in Urdu) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مانو کے مرکز برائے فاصلاتی اورآن لائن تعلیم کے تحت اردو زبان سیکھنے کے خواہش مندوں کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔

موجودہ زمانے میں اردو زبان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے۔برصغیر ہندوپاک کے علاوہ اردو زبان خلیجی ممالک شرق اوسط، وسطی ایشیا، مشرق بعید یورپ اورامریکہ کے کئی شہروں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔اردو زبان دستور ہند کے آٹھویں شیڈول

میں درج بڑی ہندستانی زبانوں میں شامل ہے۔ملک کی کچھ ریاستوں میں اسے دوسری سرکاری زبان کادرجہ حاصل ہے۔ایک اندازے کے مطابق ہندی کے ساتھ مل کر اردو دنیا کی تیسری سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔

ہندوستانی فلموں کے مکالموں اور نغموں میں اردو استعمال کی جاتی ہے۔اردو زبان کے مشاعرے، غزل اور قوالی کے پروگرام بڑے ذوق وشوق سے سنے جاتے ہیں۔ان پروگراموں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لیے غیر اردوداں سامعین اردو سیکھنا چاہتے ہیں۔گلوکار فلمی اداکار، اسٹیج پر مظاہرہ کرنے والے فن کار، الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ اینکر اور خبریں نشر کرنے والے وغیرہ سب صحیح تلفظ اور خوبصورت لہجے میں بات کرنے کے لیے اکثر اردو سیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ان کے علاوہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق افراد بھی جو اردو زبان کی شیرینی، نفاست اور شائستگی کے دلدادہ ہیں اردو سیکھنا چاہتے ہیں، یہ پروگرام ان تمام افراد کی ضرورت کی تکمیل کر سکتا ہے۔علاوہ ازیں یہ پروگرام مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے میں بھی معاون ثابت ہو گا جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔یہ پروگرام ان افراد کے لیے بھی مددگار ثابت ہو گا جو اردو زبان کے بیش بہا اور رنگا رنگ ادبی سرمائے تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

ڈپلوما اِن اردو پروگرام دو سمسٹروں پر مبنی ہے جس کے پہلے اور دوسرے سمسٹر میں تین، تین پرچے ہوں گے۔ہر پرچے میں سولہ اکائیاں ہیں جنھیں چار بلاکوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ہر پرچے کے ذریعے طلبا کو موضوع سے متعلق ڈپلوما کی سطح کے مطابق تمام ضروری معلومات پہنچانے کی ممکنہ کوشش کی گئی ہے۔ہر سمسٹر میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے طلبا کو تینوں پرچوں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے علاوہ تفویضات (Assignments) کی تکمیل بھی لازمی طور پر کرنا ہے۔تبھی وہ اس پروگرام میں کامیاب اور ڈپلوما ان اردو کے اہل قرار پائیں گے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ڈپلوما اِن اردو کے پانچویں پرچے کی کتاب پیش کر رہے ہیں جس کا عنوان ''شعری اصناف'' ہے۔دوسرے پرچے کی کتاب ''مطالعہ نظم'' میں آپ نے اردو شاعری کی مختلف اصناف سے واقفیت حاصل کی تھی۔اس کتاب میں اردو شاعری کی اہم اصناف مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، غزل اور نظم کے منتخب متون کا مطالعہ کیا جائے۔مثنوی کے زمرے میں مثنوی سحر البیان اور مثنوی زہر عشق اور قصائد کے ضمن میں ذوق اور غالب کے قصائد اور مرثیہ کے تحت انیس اور دبیر کے مرثیوں کے انتخاب شامل کیے گئے ہیں۔غزل کے زمرے میں میر، غالب، حالی، اقبال، حسرت، جگر، ناصر کاظمی، فراق، شہریار اور مغنی تبسم کی سادہ اور عام فہم غزلوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔اسی طرح نظموں میں نظیر، اختر شیرانی، اقبال، فیض، جوش اور مجاز کی نظموں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔رباعیات میں انیس، اکبر، جوش اور امجد کی رباعیات شامل کی گئی ہیں۔ہر شعری متن کے مطالعے میں اُس متن کی تشریح اور خلاصے کے علاوہ شاعر اور اُس کی شاعری کی امتیازی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے طلبا میں شعری اصناف سے دلچسپی اور شاعری کی تحسین کی صلاحیت میں اضافہ ہو گا۔

پروفیسر نکہت جہاں
کورس کو آرڈی نیٹر

شعری اصناف

بلاک I

اکائی 1: مثنوی

سحر البیان (انتخاب: شہزادہ بے نظیر کا کنویں میں قید ہونا) میر حسن

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید
1.1 مقاصد
1.2 مثنوی سحر البیان (میر حسن)
1.2.1 میر حسن کا تعارف
1.2.2 مثنوی سحر البیان کی خصوصیات
1.2.3 انتخاب مثنوی سحر البیان
1.2.4 مثنوی کی تشریح
1.3 اکتسابی نتائج
1.4 مشکل الفاظ
1.5 مشقیں
1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.0 تمہید

اس اکائی میں ہم نے مثنوی نگار میر حسن کی زندگی کے اہم واقعات اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ مثنوی کی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہوئے مثنوی سحر البیان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔ مثنوی کا پس منظر اور خاکہ بھی مختصر طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مثنوی سحر البیان سے ایک اقتباس دیا گیا ہے اور اس کی تشریح بھی کی گئی ہے تاکہ طلبہ کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ مجموعی طور پر اس مثنوی کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اکائی کے اہم سوالات بھی دیے گئے ہیں تاکہ طلبہ اس سے مزید استفادہ کر سکیں۔ اکائی میں جو مشکل الفاظ آئے ہیں انہیں معانی کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ طلبا اس سے استفادہ کریں گے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- میر حسن کا تعارف کرا سکیں۔
- مثنوی کے منتخب اشعار کا مطالعہ کر سکیں۔
- منتخب اشعار کی تشریح کر سکیں۔
- مثنوی سحر البیان کے بارے میں اظہارِ خیال کر سکیں۔

1.2 مثنوی سحر البیان (میر حسن)

1.2.1 میر حسن کا تعارف:

میر حسن (37-1736ء-1786ء) کا نام، میر غلام حسن اور تخلص حسن تھا۔ آپ مشہور ہزل گو شاعر میر غلام حسین ضاحک کے بیٹے تھے۔ ان کا خاندان چار پشتوں سے دہلی میں آباد تھا۔ میر حسن پرانی دلی کے محلہ سید واڑہ میں 37-1736ء میں پیدا ہوئے اور یہیں ان کی تعلیم اور تربیت ہوئی۔ میر حسن کا رجحان بچپن سے شاعری کی طرف تھا۔ بچپن ہی میں وہ فارسی زبان میں شعر کہتے تھے۔ لکھنؤ آنے کے بعد بھی میر حسن فارسی میں شعر کہتے رہے۔ لیکن فیض آباد پہنچنے کے بعد میر حبیب اللہ کے ایما پر انہوں نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس زمانے میں میر حسن نے فیض آباد میں میر ضیاء الدین حسین ضیاؔ سے اصلاح لی۔ میر حسن کی اردو شاعری کا آغاز بھی فیض آباد سے ہوتا ہے۔ میر حسن کی دو اہم تصانیف ہیں۔ ایک ''کلیات میر حسن'' اور دوسری ''تذکرہ شعرائے اردو''

''کلیات میر حسن'' میں میر حسن نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہ کلیات تقریباً 9 ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔

کلیات میر حسن میں چھوٹی بڑی بارہ مثنویوں کے علاوہ، سات قصیدے، ایک ترکیب بند، بارہ مخمس، ایک مسدس اور 45 رباعیات کا ردیف وار دیوان بھی شامل ہے۔ رباعیات در تعریف اہل حرفہ، قطعات ہجویات اور 277 مثلث اشعار در تعریف کندی اور طوائف وغیرہ ان کے علاوہ ہیں۔ ان کے کلیات کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

میر حسن کی دوسری اہم تصنیف ''تذکرہ شعرائے اردو'' ہے جسے حبیب الرحمن خاں شروانی نے مرتب کیا ہے۔ یہ تذکرہ تین سو چار شعرا کے حالات وانتخاب کلام پر مشتمل ہے۔ اردو شعرا کا یہ تذکرہ فارسی میں لکھا گیا ہے اور شاعروں کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے دور کے شعرا کو متقدمین کہا گیا ہے۔ جس میں فرخ سیر سے پہلے کے شعرا کے حالات اور انتخاب کلام درج ہے۔ دوسرے دور کے شعراء کو متوسطین کا نام دیا گیا ہے۔ جس میں فرخ سیر کے آخری دور سے محمد شاہ کے ابتدائی دور تک کے شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کے شعرا کو متاخرین کا نام دیا گیا ہے۔ جن میں اس دور کے قابل ذکر اور اہم معاصر شعرا شامل ہیں۔ شاعروں کے حالات اور تعارف کی نوعیت، تاثراتی معلوم ہوتی ہے، لیکن میر حسن نے اپنے معاصرین کے کلام پر جو آراء دی ہیں، ان سے شعر فہمی، فنی نظر اور مذاق سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ اس تذکرے کے مطالعے سے میر حسن کے تنقیدی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ 1785ء میں وہ سخت بیمار ہوئے اور عشرہ ماہ محرم 1786ء میں انتقال کر گئے۔ لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ، مرزا قاسم علی خاں کے باغ کے پیچھے انہیں دفن کیا گیا۔

1.2.2 مثنوی سحر البیان کی خصوصیات:

میر حسن نے چھوٹی بڑی جملہ بارہ مثنویاں لکھیں، لیکن ان سب میں اہم اور مقبول مثنوی ''سحر البیان'' ہے۔ یہ ان کی آخرِ عمر کی تخلیق ہے۔ یہ مثنوی (85-1784ء) میں مکمل ہوئی اور اس کو نواب آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

یہ مثنوی 2179 اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کے قصے میں ترتیب و ربط، توازن واختصاراور تہذیب و معاشرت کی اثر انگیز تصویریں یکجا ہو گئی ہیں۔ اس مثنوی میں منظر کشی و کردار نگاری، زبان و بیان کا فنکارانہ استعمال ایسے دلچسپ انداز سے کیا گیا ہے کہ وہ آج بھی پر اثر اور تازہ معلوم ہوتی ہے۔ میر حسن نے مختلف کہانیوں کے مختلف حصوں کو نئی ترتیب دے کر سحر البیان کی کہانی کو ایک ایسی صورت دے دی ہے کہ وہ خود ایک نئی کہانی بن گئی ہے۔

''سحر البیان'' کی کہانی بادشاہ، وزیر، شاہزادے، اور شاہزادیوں کی کہانی ہے۔ دراصل اٹھارویں صدی کا معاشرہ ذہنی طور پر اسی قسم کی کہانیوں کو قبول کرتا تھا۔ اسی وجہ سے یہ مثنوی بے حد مقبول ہوئی۔ اس مثنوی میں یوں تو چھوٹے بڑے نامور و بے نام متعدد کردار آتے ہیں۔ لیکن اصل کردار ہیں بادشاہ، شہزادہ بے نظیر، شہزادی بدر منیر، وزیر زادی، نجم النساء، پری ماہ رخ اور جنوں کے بادشاہ کا بیٹا فیروز شاہ۔ ان میں سے بے نظیر، بدر منیر، نجم النساء اور فیروز شاہ وہ اہم کردار ہیں جو کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ میر حسن نے وہ کون سا ایسا کام کیا ہے جس کی وجہ سے ''سحر البیان'' کو اردو مثنویوں میں منفرد بنا دیا ہے۔ میر حسن نے مثنوی کے اس روایتی قصے کو مختلف عناصر کی مدد سے اس طرح ترتیب دیا ہے کہ یہ ایک نیا قصہ معلوم ہوتا ہے۔ اس قصے کے پس منظر میں انسانی فطرت ونفسیات، جذبات واحساسات، قدرتی مناظر اور آرائش حسب ضرورت اور موقع و محل کے مطابق اس طرح شامل کر دیے گئے ہیں کہ یہ ایک بالکل نئی انسانی داستان معلوم ہوتی ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ میر حسن نے اس مثنوی میں اپنے دور کی زندگی و تہذیب کی ایسی زندہ اور جیتی جاگتی تصویریں پیش کی ہیں کہ یہ مثنوی اس دور کی زندگی و تہذیب کی ترجمان بن گئی ہیں۔ یہ مثنوی ڈوبتی تہذیب کی ایسی ترجمان ہے کہ اس کی مدد سے اس دور کو دوبارہ تشکیل دیا جاسکتا ہے۔

میر حسن کی اس مثنوی نے آنے والے دور کی شاعری کو متاثر کیا۔ میر انیس کے مرثیوں پر ''سحر البیان'' کا اثر نمایاں ہے۔ یہ بات بھی یاد رہے کہ میر حسن نے مثنوی کی ایک ایسی روایت کو جنم دیا جس کے اثرات اردو ادب پر کافی گہرے پڑے۔

اس اکائی میں مثنوی ''سحر البیان'' سے ایک اقتباس لیا گیا ہے۔ اس اقتباس میں شہزادی بدر منیر کے خواب کی کیفیت اور اس کی عزیز سہیلی وزیر زادی نجم النساء کے جوگن بننے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ بدر منیر نے خواب میں دیکھا کہ ایک سنسان جنگل کے تاریک کنویں میں شہزادہ بے نظیر مقید ہے اور اس کنویں سے یہ آواز بلند ہو رہی ہے کہ اے بدر منیر میں ابھی تک تیرے عشق میں گرفتار ہوں اور تیری محبت کا دم بھرتا ہوں۔ بدر منیر جب خواب سے بیدار ہوئی تو اس نے اپنے دل کی کیفیت کسی سے بیان نہیں کی۔ لیکن چہرہ سے اس کا دردِ پنہاں عیاں تھا۔ جب اس کی عزیز سہیلی وزیر زادی نجم النساء کو بدر منیر کے حال زار کا پتہ چلا تو اس نے شہزادہ بے نظیر کو تلاش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور ایک جوگن کا بھیس بدل کر، صحرا کی طرف چل پڑی۔ اپنے جسم کو بھبھوت ملا، گیروے رنگ کا لباس پہنا اور شہزادے کی تلاش میں صحرا کی طرف نکل کھڑی ہوئی۔

1.2.3 انتخاب مثنوی سحر البیان:

ذرا آنکھ جھپکی جو اس حال میں
تو دیکھا پھنسا اس کو جنجال میں

قضانے دکھایا عجب اس کو خواب
کہ دشمن نہ دیکھے یہ حال خراب

جو دیکھا تو صحرا ہے اک لق ودق
کہ رستم جسے دیکھ ہوجائے فق

نہ انسان ہے واں نہ حیوان ہے
فقط اک کفِ دست میدان ہے

مگر بیچ میں اس کے ہے اک کنواں
کہ اٹھتا ہے آہوں کا واں سے دھواں

کنویں کا ہے منھ بند، اس سے اڑی
کئی لاکھ من کی ہے اک سل پڑی

صدا واں سےہے یہ کہ بدرمنیر
ترے چاہِ غم میں ہوا ہوں اسیر

میں بھولانہیں تجھ کواے میری جاں
کروں کیاکہ ہے مجھ پہ قید گراں

پر اس قید میں بھی ترا دھیان ہے
فقط تیرے ملنے کا ارمان ہے

تو اپنی جو صورت دکھا دے مجھے
تو اس قیدِ غم سے چھڑا دے مجھے

نہیں مجھ کومرنے سے کچھ اپنے ڈر
یہ غم ہے کہ تجھ کو نہ ہووے خبر

تجھے کاش اس وقت میں دیکھ لوں
جیوں میں اگر تیرے آگے مروں

لیکن یہ کہ ہے خام میرا خیال
نہیں وصل ممکن بغیر از وصال

کوئی دم کا مہمان ہوں آج کل
اسی چاہ میں جائے گا دم نکل

یہ سن، واردات شہ بے نظیر
جو چاہے کرے بات بدرمنیر

یہ ہرگز میسر نہ آئی اسے
قضا نے نہ اس کی سنائی اسے

یکایک گئی آنکھ اتنے میں کھل
بھرے اشک رخسار پر آئے ڈھل

نہ وہ چاہ دیکھا نہ ہمراز وہ
پڑی گوش میں پھر نہ آواز وہ

صدا اپنے یوسف کی سن خواب سے
اٹھی باؤلی جان بے تاب سے

کہا گوکسی سے نہ اس نے یہ بھید
ولے جوں مہِ صبح، چہرہ سفید

چھپایا بہت اس نے پر ہم نشیں
چھپانے سے آتش چھپے ہے کہیں

کسی سے کسی کی جو ہوتی ہے لاگ
بغیر از کہے اور لگتی ہے آگ

خواصیں کئی وے جو ہمراز تھیں
بڑی خدمتوں میں سرافراز تھیں

کہا ان سے رو رو کے احوال خواب رلایا انہیں پڑھ کے غم کی کتاب
سنا جب کہ نجم النساء نے یہ حال ہوئی بے قراری تب اس کو کمال
لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا ترے واسطے میں نے اب دکھ سہا
بس اب سربصحرا نکلتی ہوں میں اسے ڈھونڈلانے کو چلتی ہوں میں
کہا شاہزادی نے سن اے رفیق ہوئی میں تو اس چاہ غم میں غریق
بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو کہ وہ ہے پری اور انسان تو
رسائی تیری کیوں کہ ہوگی وہاں مجھے بھی نہ دے ہاتھ سے میری جاں
میں جیتی ہوں اس آسرے پر فقط کہ ہوتا ہے تجھ سے مرا غم غلط
وگرنہ میں رک رک کے مرجاؤں گی اسی طرح جی سے گذرجاؤں گی
کہا اس نے کیا کیجیے پھر بھلا پڑی اب تو اپنے ہی سر پر بلا
میں اس عشق کا یہ نہ سمجھی تھی ڈول ترے غم سے آنے لگا مجھ کوہول
یہ کہہ اس نے رورو اتارا سنگار کیا اپنی پشواز کو تار تار
گریبان کو مثل گل چاک کر دیا خاک پر پھینک ادھر اور ادھر
پھر آئے جو کچھ اس کو ہوش وحواس سجا تن پہ جوگن کا اس نے لباس
پہن سیلی اور گیروا اوڑھ کھیس چلی کرکے صحرا کو جوگن کا بھیس
کئی سیر موتی جلا راکھ کر بھبھوت اپنے تن پر ملا سر بسر
زری کے دوپٹے سے چھاتی کو باندھ بدن کو چھپا اور گاتی کو باندھ
زمرد کے مندرے لگا کان میں کہ جوں سبزہ وگل گلستان میں
گلے پیچ ڈال اپنے مالوں کے تیئں پریشان کر اپنے بالوں کے تیئں
لٹیں دےکے بل دوش پر چھوڑ دیں وہ باگیں سی شبدیز کی موڑ دیں
زمرد کی سمرن کو ہاتھوں میں ڈال اور اک بین کاندھے پر اپنے سنبھال
چلی بن کے جوگن وہ باہر کے تیئں دکھاتی ہوئی حال ہر ہر کے تیئں

1.2.4 مثنوی کی تشریح:

اشعار 1 سے 6: شہزادہ بے نظیر ایک لق ودق صحرا کے اندھے کنویں میں قید ہے اور سخت مصیبت اور آزار میں مبتلا ہے۔ ایسے میں شہزادی بدر منیر ایک خواب دیکھتی ہے۔ اس نے دیکھا کہ چاروں طرف ایک چٹیل میدان پھیلا ہوا ہے۔ ایک ایسا بیابان کہ جس کے خوف سے رستم جیسے بہادر پہلوان کا دل بھی دہل جائے۔ اس صحرا کے بیچوں بیچ ایک کنواں ہے جس میں شہزادہ بے نظیر مقید ہے۔ اس تاریک کنویں سے بے نظیر کی آہوں کا دھواں اٹھ رہا ہے۔ کنویں کا منھ کئی لاکھ من وزنی سیل سے بند کر دیا گیا ہے۔

اشعار 7 سے 14: کنویں سے یہ صدا آرہی ہے کہ اے بدر منیر میں اس وقت سخت مصیبت اور پریشانی میں گرفتار ہوں لیکن ابھی تک تیری محبت کا دم بھر رہا ہوں۔ مجھے اپنی بربادی یا موت کا غم نہیں ہے۔ غم تو صرف اس بات کا ہے کہ تو میری موت سے بے خبر نہ رہ جائے۔ کاش اس وقت مجھے تیرا دیدار نصیب ہو اور میں تیرے آگے اپنی جان دے دوں۔ میں شاید صرف چند دن کا مہمان ہوں اور آج کل میں میرا دم اسی کنویں میں نکل جائے گا۔

اشعار 15 تا 19: خواب کے عالم میں بدر منیر نے بے نظیر کی یہ حالت دیکھی تو چاہا کہ اس سے ہمدردی کا اظہار کرے اور اس مصیبت سے نجات دلائے، لیکن یکا یک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس کی آنکھوں سے اشک، رخساروں پر ڈھلنے لگے۔ اب اس کے سامنے نہ وہ کنواں تھا اور نہ وہ اپنے محبوب کی آواز سن سکتی تھی۔

اشعار 20 تا 24: بدر منیر نے اپنی مصیبت اور پریشانی کا کسی سے اظہار نہیں کیا لیکن اس کا چہرہ صبح کے چاند کی طرح سفید ہو گیا۔ بے نظیر کی مفارقت میں بدر منیر کی حالت زار کا نقشہ میر حسن نے ان اشعار میں کھینچا ہے۔

کہا گو کسی سے نہ اس نے یہ بھید
ولے جوں مہ صبح چہرہ سفید
وہ مہتاب سا چہرہ ہو زرد زرد
سراپا ہوا شکل اندوہ و درد

پہلے شعر میں بدر منیر کے دلکش چہرے کو صبح کے بے رونق چاند سے تشبیہ دی گئی ہے اور دوسرے شعر میں کہا گیا ہے کہ پریشانی کے عالم میں بدر منیر کا مہتاب جیسا چہرہ زرد ہو گیا ہے اور وہ سر سے پاؤں تک مجسم درد دکھائی دے رہی ہے۔

بدر منیر نے اپنے رنج و غم کی کیفیت کا ذکر کسی سے نہیں کیا لیکن آگ چھپانے سے بھلا کیسے چھپ سکتی ہے۔ جب کسی کو کسی سے لگاؤ ہو جاتا ہے، محبت ہو جاتی ہے تو اس کی آگ خود بخود پھیلنے لگتی ہے۔ یعنی جذبہ عشق چھپانے سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ بدر منیر اپنا احوال سنا کر خود بھی روئی اور اپنی ہمراز سہیلیوں اور ان خواصوں کو بھی رلایا جو اس کے محل میں بڑی خدمتوں پر سرفراز تھیں۔

اشعار 25 تا 32: بدر منیر کی پریشانی کی کیفیت جب اس کی عزیز سہیلی، وزیر زادی نجم النساء نے سنی تو وہ بے قرار ہو گئی۔ اس نے کہا کہ محض آہ وزاری کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں تیرے لیے ہر مصیبت اٹھانے کو تیار ہوں اور بے نظیر کو تلاش کرنے کے لیے صحرا کا رخ کرتی ہوں۔ بدر منیر نے کہا کہ میں دام محبت میں اسیر ہوں اور بہر حال اس کی سزا مجھے ملنی چاہیے لیکن تو اپنی بھلی چنگی جان کو مصیبت میں ڈال رہی ہے۔ بے نظیر کے بغیر میں اس لیے زندہ ہوں کہ تیری موجودگی سے میرا غم غلط ہو جاتا ہے۔ تیری غیر موجودگی میں میں گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔

اشعار 33 تا 45: نجم النساء نے کہا کہ مجھ سے تیری پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔ تو جس عشق میں گرفتار ہے اس کے تیور ہی نرالے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے روتے ہوئے اپنا سنگار اتارا، اپنی پشواز اور گریبان کو تار تار کر کے زمین پر ادھر ادھر پھینک دیا اور جوگن کا روپ اختیار کر لیا۔ گلے میں سیلی پہنی، گیروے رنگ کی ایک چادر اوڑھی۔ کئی سیر موتیوں کو جلا کر اس کی راکھ اپنے تن پر ملی اور صحرا کا رخ کیا۔ زری کا دوپٹہ سینے پر باندھا، کانوں میں زمرد کے مندرے دمک رہے تھے اور گلے میں کئی مالے لٹک رہے تھے۔ زلفوں کو بل دے کر دوش پر اس طرح چھوڑ دیا، گویا شبدیز کی باگیں موڑ دی گئی ہیں۔ زمرد کی سمرن ہاتھوں میں لے لی اور بین اپنے کاندھے پر رکھ کر، جوگن کے روپ میں صحرا کی طرف چل نکلی۔

1.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- میر حسن 1736ء میں دہلی کے محلہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا۔
- ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ شاعری کی طرف رجحان بچپن ہی سے تھا۔ وہ فارسی زبان میں شعر کہتے تھے۔
- جب تک دہلی اور لکھنؤ میں رہے میر حسن فارسی میں شعر کہتے رہے۔ لیکن فیض آباد پہنچنے کے بعد میر حبیب اللہ کے ایما پر اردو میں بھی شعر کہنا شروع کیا۔ اس زمانے میں میر حسن نے فیض آباد میں میر ضیاء الدین حسین ضیاؔ سے اصلاح لی۔ میر حسن کی اردو شاعری کا آغاز بھی فیض آباد سے ہوتا ہے۔
- میر حسن کی مثنوی "سحر البیان" اٹھارویں صدی کے جاگیر دارانہ نظام کی پیداوار ہے۔ لکھنوی تہذیب کی جھلکیاں اس مثنوی میں نظر آتی ہیں۔
- اس مثنوی کو لکھتے وقت میر حسن کے پیش نظر فارسی اور اردو کی بھی مثنویاں تھیں۔ فارسی مثنویوں میں فردوسی کی "شاہ نامہ" نعمت خاں عالی کی مثنوی "حسن و عشق" کے اثرات نمایاں ہیں کیونکہ اس دور کے اردو ادب پر فارسی ادب کی چھاپ نظر آتی ہے۔
- فارسی کے اشعار، محاورے روز مرہ اور مضامین اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ میر حسن نے بھی اپنی مثنوی سحر البیان میں کئی جگہ فارسی اشعار کو حسب ضرورت استعمال کیا ہے۔
- میر حسن کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس تہذیب کی نمائندگی کی ہے جو ڈوبتی نظر آتی ہے۔ اس کی مثال اس چراغ کی سی ہے جو بجھنے سے پہلے تیز روشنی دینے لگتا ہے۔ یہ مثنوی اسی ڈوبتی ہوئی تہذیب کی ترجمان ہے۔
- جب شہزادہ بے نظیر کو ماہ رخ پری اٹھا لے جاتی ہے تو شہزادہ آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کرنے کی بجائے صرف رونے اور آنسو بہانے کا کام کرتا ہے۔ "رونا" اس تہذیب کی بے بسی، بے کسی اور بے عملی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہی اس تہذیب کا مزاج ہے اور یہی سحر البیان کی کہانی کا مزاج بھی ہے۔ سحر البیان کی کہانی اپنے دور کی تہذیب کی کہانی ہے جس میں میر حسن نے انسانی جذبات کے اظہار سے آفاقیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔
- اس مثنوی کو پڑھنے کے بعد مجموعی طور پر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ میر حسن نے ایک ایسا تجربہ کیا تھا جو اس تہذیب کی

روح کی حقیقی کہانی ہے جس کا اظہار انہوں نے مثنوی کے کرداروں سے کیا ہے۔ یہ میر حسن کے فن کا جادو ہے۔

1.4 مشکل الفاظ

اڑی ہوئی	حائل، پھنسی ہوئی	Stuck, Obstructed
باؤلی	دیوانی	Crazy, Mad
اندوہ	رنج	Sorrow, Grief
بھید	راز	Secret, Mystery
بھیس بدلنا	روپ بدلنا، شکل تبدیل کرنا	Disguise, Change Appearance
پشواز	فراک کی وضع کی عورتوں کی پوشاک	Traditional Frock-Like Garment For Women
چاہ	کنواں	Well (Water Source)
رستم	ایران کے ایک پہلوان کا نام	Name Of A Famous Persian Hero
ڈول	ڈھنگ، وضع قطع	Style, Manner, Posture
سر بصحرا	جنگل کی طرف	Towards The Desert/Jungle
سیلی	بالوں کی وہ ڈوری جسے جوگی گلے میں پہنتے ہیں	Hair Braid Worn Around The Neck By Yogis
غریق	ڈوبی ہوئی	Drowned, Submerged
فق ہونا	پریشانی یا صدمے سے چہرے کا رنگ بدل جانا	Face Turning Pale Due To Worry Or Shock
قید گراں	بھاری قید، سخت مصیبت	Heavy Imprisonment, Severe Trouble
گوش	کان	Ear
گاتی	وہ چادر یا دوپٹہ جسے بغلوں کے نیچے سے نکال کر سینے پر گرہ دیتے ہیں	Type Of Scarf Or Cloth Tied Under The Armpits And Over The Chest
لاگ	لگاؤ، محبت	Attachment, Love
صحرا	جنگل، بیاباں	Desert, Wilderness
ہزل گو شاعر	بے ہودہ اشعار کہنے والا شاعر	Poet Of Nonsensical Verses
بھبھوت	راکھ	Ash
جنجال	مصیبت، پریشانی، آفت	Trouble, Complication, Problem
خام خیالی	جھوٹا خیال، وہم	False Thought, Illusion
رسائی	پہنچ	Reach, Access

سمرن	تسبیح	Rosary, Remembrance
شبدیز	کالا گھوڑا	Black Horse
غم غلط کرنا	دل بہلانا	To Console, To Distract From Sorrow
قضا	قسمت، مشیتِ الٰہی	Fate, Divine Decree
کھیس	ایک قسم کا موٹا کپڑا، چادر	Thick Cloth, Shawl
گنج	خزانہ	Treasure, Wealth
لق دق	چٹیل میدان	Uneven Field
مندروں	جوگیوں کے کان کے کنڈل	Ear Rings Of Yogis
ہول	خوف، وحشت	Fear, Terror

1.5 مشقیں

مشق 1۔ درج ذیل اشعار کی تشریح اپنے الفاظ میں کیجیے۔

کہا گو کسی سے نہ اس نے یہ بھید
ولے جوں مہِ صبح چہرہ سفید
وہ مہتاب سا چہرہ ہو زرد زرد
سراپا ہوا شکل اندوہ و درد

....

....

....

مشق 2۔ نیچے دیے گئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

باؤلی : ....

بھید : ....

بھیس بدلنا: ....

چاہ : ....

صحرا : ....

جنجال : ....

خام خیالی : ....

غم غلط کرنا: ....

1.6 نمونہ امتحانی سوالات

1.6.1 معروضی سوالات:

(1) میر حسن کہاں پیدا ہوئے؟

(a) لکھنؤ (b) دہلی (c) آگرہ (d) فیض آباد

(2) تذکرہ شعرائے اردو کس کی تصنیف ہے؟

(a) میر انیس (b) میر تقی میر (c) میر حسن (d) میر ضاحک

(3) میر حسن کے والد کا کیا نام تھا؟

(a) میر خلیق (b) میر انیس (c) میر امامی (d) میر ضاحک

(4) میر حسن نے کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟

(a) بارہ (b) دس (c) آٹھ (d) پانچ

(5) تذکرہ شعرائے اردو کو کس نے مرتب کیا؟

(a) مسعود حسین خاں (b) اجمل خاں (c) رام لعل (d) حبیب الرحمٰن شیروانی

(6) شہزادی بدر منیر کا ذکر کس مثنوی میں ہوا ہے؟

(a) سحر البیان (b) گل بکاؤلی (c) خواب وخیال (d) زہر عشق

(7) جوگن کون بنتا ہے؟

(a) بدر منیر (b) نجم النسا (c) بے نظیر (d) فیروز شاہ

(8) شبدیز کے کیا معنی ہیں؟

(a) کالا گھوڑا (b) سفید گھوڑا (c) دریائی گھوڑا (d) عربی گھوڑا

(9) شہزادہ بے نظیر کہاں قید تھا؟

(a) کنویں میں (b) جیل میں (c) گھر میں (d) غار میں

(10) میر حسن کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(a) فیض آباد (b) دہلی (c) حیدرآباد (d) لکھنؤ

1.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. بدر منیر نے کیا خواب دیکھا، خواب دیکھنے کے بعد بدر منیر کا کیا عالم ہوا؟
2. نجم النسا نے بے نظیر کو بچانے کے لیے کیا طریقہ اپنایا۔ چند جملوں میں بیان کیجیے۔

3. شہزادہ بے نظیر کیسے قید ہوا؟ مختصر طور پر بیان کیجیے۔

4. سحر البیان کے مشہور کرداروں کے بارے میں لکھیے۔

5. ذیل میں دیے گئے اشعار کی تشریح کیجیے۔

کہا شاہزادی نے سن اے رفیق
ہوئی میں تو اس چاہ غم میں غریق
بھلی چنگی اپنی نہ کھو جان تو
کہ وہ ہے پری اور انسان تو

1.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. میر حسن کے حالات زندگی تحریر کیجیے۔

2. مثنوی سحر البیان کی خصوصیات بیان کیجئے۔

3. سحر البیان کا خلاصہ لکھیے۔

1.6.1 کے جوابات:

(i) B	(ii) CC	(iii) D	(iv) A	(v) D
(vi) A	(vii) B	(viii) A	(ix) A	(x) D

اکائی 2: مثنوی

"زہر عشق" مرزا شوق

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید

2.1 مقاصد

2.2 مثنوی " زہر عشق" مرزا شوق

2.2.1 مرزا شوق کا تعارف

2.2.2 "زہر عشق" کی خصوصیات

2.2.3 " زہر عشق" کا متن

2.2.4 متن کی تشریح

2.3 اکتسابی نتائج

2.4 مشکل الفاظ

2.5 مشقیں

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.0 تمہید

اس اکائی میں ہم مرزا شوق کی مثنوی "زہر عشق" سے ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں۔ مرزا شوق کی زندگی کے حالات اور ان کے کارناموں کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ اس مثنوی کی خصوصیات کے بارے میں بحث کی جائے گی اور اشعار کی تشریح کی جائے گی تاکہ طلبا کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ:

- مثنوی نگار کا تعارف پیش کر سکیں۔
- مثنوی "زہر عشق" کے منتخب متن کو پڑھ سکیں۔
- مثنوی زہر عشق کی خصوصیات کا جائزہ لے سکیں۔
- مثنوی زہر عشق کے اقتباس کی تشریح کر سکیں۔

2.2 "مثنوی زہر عشق" مرزا شوق

2.2.1 مرزاشوق کا تعارف:

تصدق حسین نام تھا اور حکیم نواب مرزا شوق کے نام سے مشہور تھے۔ ان کے اجداد شاہان اودھ کے دربار میں بڑے مرتبہ پر فائز تھے۔ مرزا شوق خوش باش اور رنگین مزاج انسان تھے۔ اودھ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ 500 پانچ سو روپیہ ماہوار مشاہرہ (وظیفہ) مقرر تھا۔ اور انعام واکرام کی کوئی حد نہ تھی۔ مرزا شوق کو فن طب کے علاوہ مختلف فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ غزلیں بھی لکھی ہیں لیکن ان کا نام اپنی تین مثنویوں کی وجہ سے، اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ یہ مثنویاں ہیں بہار عشق، فریب عشق اور زہر عشق۔ اس کے علاوہ ان کی غزلیات کا ایک دیوان اور واسوخت کا ایک مجموعہ بھی ہے۔

مرزا شوق نے لکھنوی تہذیب و معاشرت کی تصویر کشی کی ہے خاص طور پر عورتوں کی بول چال اور ان کے محاوروں وغیرہ کو وقت ضرورت استعمال کیا ہے۔ مرزا شوق سلطان عالم واجد علی شاہ کے ہم عصر تھے۔ اودھ دربار سے بھی وابستہ رہے۔ مرزا شوق کے چچا حکیم الملک مرزا علی خاں شاہان اودھ کے دربار میں بڑے مرتبہ پر فائز تھے۔ مرزا شوق کی شہرت مثنوی "زہر عشق" اور "بہار عشق" کی وجہ سے ہے۔

2.2.2 "زہر عشق" کی خصوصیات:

شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی میں فوق فطری عنصر بالکل نہیں ملتا۔ مثنوی کا قصہ اس کے کردار کو پیش آنے والے واقعات، زندگی کے حقیقی واقعات معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ مثنوی حقیقت نگاری کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ مثنوی کی زبان بھی نہایت سادہ اور لکھنؤ کی عام بول چال کی زبان ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں
ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں

مرزا شوؔق نے آسان الفاظ میں ایک حسین لڑکی کی دلی کیفیت کو بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ مثنوی کے ہیرو کی حیثیت سے شاعر نے خود کو پیش کیا ہے۔ گویا یہ واردات ان کی آپ بیتی ہے۔ واجد علی شاہ کے زمانے کے لکھنؤ کا پس منظر ہے۔ شاعر کے ہم سایہ میں ایک بڑے سوداگر کا گھر تھا۔ اس کی شائستہ اور تعلیم یافتہ لڑکی سے شاعر کو عشق ہو گیا پھر ملاقات کی صورت نکلی۔ وقفہ وقفہ سے درگاہ کو جانے کے بہانے یہ لڑکی شاعر کے مکان آیا کرتی تھی۔ جب لڑکی کے والدین کو پتہ چلا تو انہوں نے طے کیا کہ اس حسینہ کو کچھ عرصے کے لیے بنارس میں اپنے ایک عزیز کے یہاں بھیج دیا جائے۔ عمر کے تقاضے اور لکھنؤ کے ماحول کی رنگینی سے متاثر ہو کر لڑکی نے محبت کی بازی کھیلی لیکن بات رسوائی تک پہنچی تو اس نے زہر کھا کر خودکشی کرنے کی ٹھانی۔ قبل اس کے کہ والدین اس کو بنارس بھیجتے، ایک رات محبوب کے گھر آئی اور اسے اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا اور دوسری صبح زہر کھا کر ہمیشہ کے لیے موت کی گود میں سو گئی۔ خودکشی سے پہلے کی رات اس نادان لڑکی نے اپنے محبوب سے جو باتیں کیں وہی مثنوی کا نہایت دلچسپ اور اثر انگیز حصہ ہے۔ مثنوی کا یہ اقتباس آخری رات کی روداد پر مبنی ہے۔ یہ اشعار لڑکی کی زبان سے بیان ہوتے ہیں۔

2.2.3 انتخاب ''مثنوی زہر عشق''، کا متن:

اقربا میرے ہوگئے آگاہ
تم سے ملنے کی اب نہیں کوئی راہ
مشورے یہ ہوئے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں
گو ٹھکانے نہیں ہیں ہوش و حواس
پر یہ کہنے کو آئی ہوں ترے پاس
جائے عبرت سرائے فانی ہے
مورد مرگ ناگہانی ہے
اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحب نوبت و نشاں تھے جو
آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی
غیرت حورِ مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام نام باقی ہے
رشک یوسف جو تھے جہاں میں حسیں
کھا گئے ان کو آسمان و زمیں
ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے
ہے نہ شیریں نہ کوہکن کا پتا

نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا
بوئے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلی ہے
صبح کو طائران خوش الحان
پڑھتے ہیں کل من علیہا فان
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے
زندگی بے ثبات ہے اس میں
موت عین حیات ہے اس میں
ہم بھی گر جان دے دیں کھا کر سم
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو ہمجولیوں میں بہلانا
یا مری قبر پر چلے آنا
جا کے رہنا نہ اس مکان سے دور
ہم جو مرجائیں تیری جان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی
ڈھونڈھنے کس طرف کو جائے گی
روکے رہنا بہت طبیعت کو
یاد رکھنا مری وصیت کو
ضبط کرنا اگر ملال رہے
میری رسوائی کا خیال رہے
میرے مرنے کی جب خبر پانا
یوں نہ دوڑے ہوئے چلے آنا
جمع ہولیں سب اقربا جس دم

رکھنا اس وقت تم وہاں پہ قدم
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم
ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
ہو گئے تم اگرچہ سودائی
دور پہونچے گی میری رسوائی
لاکھ تم کچھ کہو نہ مانیں گے
لوگ عاشق ہمارا جانیں گے
طعنہ زن ہوں گے سب غریب و امیر
قبر پر بیٹھنا نہ ہو کے فقیر
سامنا ہو ہزار آفت کا
پاس رکھنا ہماری عزت کا
جب جنازہ مرے عزیز اٹھائیں
آپ بیٹھے وہاں نہ اشک بہائیں
میری منت پہ دھیان رکھیے گا
بند اپنی زبان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا
نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
اشک آنکھوں سے مت بہایئے گا
ساتھ غیروں کی طرح جایئے گا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے
سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
رنگ دل کے بدل نہ جائیں کہیں
منہ سے نالے نکل نہ جائیں کہیں
ساتھ چلنا نہ سر کے بال کھلے

تا کسی شخص پر نہ حال کھلے
ہوتے آتش کے ہیں یہ پر کالے
تاڑ جاتے ہیں تاڑنے والے
ہو بیاں گر کسی جگہ مرا حال
تم نہ کرنا کچھ اس طرف کو خیال
ذکر سن کر مرا نہ رو دینا
میری عزت نہ یوں ڈبو دینا
دل میں کڑھنا نہ مجھ سے چھوٹ کے تو
رونا مت سینہ گھونٹ گھونٹ کے تو
آ کے رو لینا میری قبر کے پاس
تا نکل جائے تیرے دل کی بھڑاس
اگر آ جائے کچھ طبیعت پر
پڑھنا قرآن میری تربت پر
غنچۂ دل مرا کھلا جانا
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا
دیکھئے کس طرح پڑے گی کل
سخت ہوتی ہے منزل اول
کبھی آجائے گر ہمارا دھیان
جاننا ہم پہ ہوگئی قربان
دل میں کچھ آنے دیجیو نہ ملال
خواب دیکھا تھا کیجیو یہ خیال
رنج و راحت جہاں میں تو ام ہے
کہیں شادی ہے اور کہیں غم ہے
ہے کسی جا پہ جشن شام و پگاہ

ہے کسی جا صدائے نالہ و آہ
مرگ کا کس کو انتظار نہیں
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
حشر تک ہو گی پھر یہ بات کہاں
ہم کہاں تم کہاں یہ رات کہاں
کہہ لو سن لو جو کچھ کہ جی میں آئے
پھر خدا جانے کیا نصیب دکھائے
دل کو اپنے کرو ملول نہیں
رونے دھونے سے کچھ حصول نہیں
پھر خدا جانے کیا مشیت ہے
اتنی صحبت بہت غنیمت ہے
ہم تو اٹھتے ہیں اس مکاں سے کل
اب تو جاتے ہیں اس جہاں سے کل
ہو چکا آج جو کہ تھا ہونا
کل بسائیں گے قبر کا کونا
دیکھ لو آج ہم کو جی بھر کے
کوئی آتا نہیں ہے پھر مر کے
ختم ہوتی ہے زندگانی آج
خاک میں ملتی ہے جوانی آج
چین دل کو نہ آئے گا تجھ بن
اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن
اب تم اتنی دعا کرو مری جان
کل کی مشکل خدا کرے آسان
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا

نہ ملا کچھ مزا جوانی کا

دل میں لے کر تمہاری یاد چلے
باغ عالم سے نا مراد چلے
اسی غم نے تو مجھ کو مارا ہے
صدمہ تیرا نہیں گوارا ہے
اپنے مرنے کا کچھ نہیں ہے الم
دل میں میرے فقط ہے اس کا غم
پر میں اب اس کو کیا کروں کمبخت
آسماں دور ہے زمیں ہے سخت
گو کہ عقبیٰ میں رو سیاہ چلی
مگر اپنی سی میں نباہ چلی
جی کو تم پر فدا کیا میں نے
حق وفا کا ادا کیا میں نے
بولی پھر زانوؤں پہ مار کے ہاتھ
نہیں معلوم اب ہے کتنی رات
جوں جوں گھڑیال واں بجاتا تھا
جی مرا سنسنایا جاتا تھا
یوں تو کوئی نہ درد و غم میں کڑھے
پھولے جاتے ہیں ہاتھ پاؤں مرے
کچھ عجب ہو رہا ہے جان کا طور
کہتی ہوں کچھ نکلتا ہے کچھ اور
آنسو آنکھوں میں بھر بھر آتے ہیں
دست و پا سارے تھرتھراتے ہیں
دل کو سمجھاتی ہوں میں بہتیرا

پر سنبھلتا نہیں ہے جی میرا
گو تو بیٹھا ہوا ہے پاس مرے
پر ٹھکانے نہیں حواس مرے
ہوش آئے ہوئے بھی جاتے ہیں
دل میں کیا کیا خیال آتے ہیں
پیش یوں فرقت حبیب نہ ہو
کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

2.2.4 انتخاب مثنوی "زہر عشق" کے اشعار کی تشریح:

اشعار 1 تا 10 : آخری رات کی اس ملاقات میں اپنی مختصر زندگی کے المناک انجام کا شدید احساس لڑکی کے دل و دماغ پر طاری ہے۔ وہ محبوب سے کہتی ہے کہ میرے والدین کو اس واقعہ کا علم ہو گیا ہے۔ اب تم سے ملنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ آپس میں مشورے ہو رہے ہیں کہ اسے بنارس بھیج دو۔ میرے ہوش و حواس ٹھکانے نہیں۔ لیکن چند باتیں تمہیں سنا دینا ضروری سمجھتی ہوں۔ یہ دنیا جائے عبرت ہے۔ خوشیاں، مسرتیں اور زندگی کی نعمتیں جلد ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا میں کیسے کیسے لوگ گذرے ہیں۔ بادشاہ، حکمراں اور مہ جبیں، جن پر حوریں بھی رشک کرتی ہوں گی۔ جواں مرد سپاہی جن کی قوت اور بہادری کے چرچے دنیا میں مشہور تھے۔ ان سب کو زمین و آسمان کھا گئے۔

اشعار 11 تا 27: شیریں اور کوہکن کے افسانے دنیا میں مشہور ہیں لیکن شیریں اور کوہکن کا پتہ ہے نہ نل و دمن کا۔ صبح کو پرندے "کل من علیہا فان" کے نغمے گاتے ہیں۔ موت سے کسی کو نجات نہیں ہے۔ میں بھی اگر زہر کھا کر جان دیدوں تو تم غم نہ کرنا اور آنسو نہ بہانا۔ یہاں سے دور کسی جگہ جا کر نہ رہو، ورنہ میری روح تمہیں تلاش کرتی رہے گی۔ تمہیں غم کو ضبط کرنا ہو گا ورنہ تمہارے اظہار غم سے میری رسوائی ہو گی۔ میرے مرنے کی خبر ملے تو دیوانہ وار دوڑے ہوئے چلے نہ آؤ اور تابوت کے ساتھ روتے ہوئے نہ چلو۔ اگر تم نے ایسی دیوانہ وار حرکتیں کیں تو میری رسوائی دور تک پہنچے گی۔

اشعار 28 تا 59: کبھی کبھی تنہا میری قبر پر آ جایا کرو۔ تنہائی میں رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی ہے۔ اگر میری تربت پر قرآن پڑھو اور دو پھول چڑھا جاؤ تو اس سے میری روح کو سکون ہو گا۔ کبھی میری یاد آ جائے تو بس یہ سمجھنا کہ وہ مجھ پر قربان ہو گئی۔ یہ تصور کرو گویا کہ ایک خواب دیکھا تھا۔ زندگی میں شادی اور غم دونوں ساتھ چلتے ہیں۔ ہر ایک کو مرنا ہے۔ آج کی رات ہے پھر پتہ نہیں کیا ہو۔ چند لمحے جو ملاقات کے میسر آ گئے ہیں، یہ بھی غنیمت ہیں۔ کل ہم اس مقام پر ہوں گے اور نہ اس جہاں میں۔ شاید کل میں قبر کے گوشے کو آباد کروں گی۔ تم سے بچھڑ کر خود میری روح بھی سکون نہ پائے گی۔ اب شاید حشر کے دن ہی ہماری ملاقات ہو۔ تم سے یہی خواہش ہے کہ میرے حق میں دعا کرو کہ کل کی مشکل منزل خدا آسان کر دے۔ میری زندگی بہت مختصر ثابت ہوئی۔ زندگی کی نعمتیں بالکل عارضی نکلیں۔ اب تمہاری یاد ساتھ لے کر اس دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں، اپنے مرنے کا مجھے کوئی غم نہیں۔ غم اس کا ہے کہ تم

میری جدائی کیسے برداشت کروگے۔ اگرچہ میں بدنامی کا داغ لے کر دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں لیکن میں نے وفاداری کا حق ادا کر دیا ہے اور جو کچھ مجھ سے ممکن تھا کر گذر رہی ہوں۔

اشعار 60 تا 75: پتہ نہیں کہ کتنی رات گذر چکی ہے۔ گھڑیال کا گھنٹہ بجتا ہے تو میرے ہاتھ پاؤں پھولے جاتے ہیں۔ دل و دماغ درہم برہم ہو رہے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن زبان سے کچھ اور نکلتا ہے۔ آنسو نہیں تھمتے اور ہاتھ پاؤں تھر تھرا رہے ہیں۔ میں ضبط کی کافی کوشش کر رہی ہوں لیکن جی نہیں سنبھلتا۔ اگرچہ تم پاس بیٹھے ہوئے ہو، لیکن میرے حواس ٹھکانے نہیں اور خیالات کا ایک طوفان ذہن میں امڈ رہا ہے۔ محبوب سے ہمیشہ کے لیے یہ جدائی خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔

2.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مرزا شوق کا نام تصدق حسین تھا۔ اردو دنیا میں مرزا شوق کے نام سے مشہور تھے۔
- مرزا شوق ماہر حکیم تھے۔ اس کے علاوہ مختلف فنون لطیفہ سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کا نام اپنی تین مثنویوں "زہر عشق، بہار عشق، فریب عشق" کی وجہ سے، اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔
- مرزا شوق کی غزلیات کا ایک دیوان اور واسوخت کا ایک مجموعہ بھی ہے۔
- شوق کی مثنوی ''زہر عشق'' کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس مثنوی میں فوق فطری عنصر بالکل نہیں ملتا۔ اس مثنوی کی زبان بھی نہایت سادہ اور لکھنؤ کی عام بول چال کی زبان ہے۔
- مرزا شوؔق نے آسان الفاظ میں ایک حسین لڑکی کی دلی کیفیت کو بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ مثنوی کے ہیرو کی حیثیت سے شاعر نے خود کو پیش کیا ہے۔ گویا یہ واردات ان کی آپ بیتی ہے۔
- مرزا شوق نے اپنے اس ہیرو کو اس مثنوی میں ایک بالکل معمولی انسان کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ ایک اوسط درجے کا شخص ہے جس میں بے عمل جذباتیت بھری ہوئی ہے اور وہ تدبیر سے زیادہ تقدیر کا قائل ہے۔
- مرزا شوق نے اپنی ہیروئن کا کردار پیش کرنے میں بڑی ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس ہیروئن کے خیالات میں بلندی اور مضبوطی پائی جاتی ہے اور اس کے اندر محبت، ایثار اور عمل کا جذبہ اور مستقل مزاجی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لیے وہ مثنوی میں معشوق سے زیادہ عاشق اور بلند نظر آتی ہے۔ اسے اپنے خاندان کی عزت کا بھی پورا احساس ہے۔
- مثنوی زہر عشق، لکھنؤ کے زوال پذیر معاشرے کی ترجمانی کرتی ہے اور اس مثنوی میں جتنے کردار سامنے آتے ہیں وہ سب اسی ماحول و معاشرے کی پیداوار ہیں۔ مرزا شوق نے اس مثنوی میں لکھنؤ کے جاگیردارانہ سماج اور اس کے اخلاقی زوال کی صاف تصویر پیش کی ہے۔

2.4 مشکل الفاظ

اقربا	قریب کے لوگ، رشتہ دار	Relatives, Near Ones

Place Of Arrival/Entry, Source	کسی چیز کے وارد ہونے کی جگہ	مورد
Name Of Rustom's Grandfather (Persian Hero)	ایران کے مشہور پہلوان رستم کے داداکانام	سام
Majnun, Lover Of Layla	مجنوں، لیلیٰ کے عاشق کانام	قیس
Melodious, Good Voice	اچھی آواز والا	خوش الحان
Unstable, Not Lasting	قائم نہ رہنے والا	بے ثبات
Coffin	وہ صندوق جس میں لاش رکھ کر لے جاتے ہیں	تابوت
Twins, Born Together	ایک ساتھ پیدا ہونے والے دو بچے، جڑواں	توام
Humiliated, Disgraced	ذلیل، شرمندہ، بدنام	روسیاہ
Lesson, Moral, Admonition	نصیحت	عبرت
Death	موت	مرگ
Reversed, Changed, Overturned	الٹا، بدلا ہوا	منقلب
Nal, A Lover From Ancient India Who Loved Daman	قدیم ہندوستان کے عاشق و معشوق	نل و دمن
Salvation, Deliverance	نجات	رستگاری
Pieces, Fragments	ٹکڑے	پرکالے
Bud Of The Heart (Unopened Flower)	دل کا پھول جو ابھی کھلا نہیں	غنچۂ دل
Grief, Sorrow	غم، دکھ	الم
Hereafter, Afterlife	عالمِ آخرت	عقبیٰ
Morning, Early Hour	سویرا، صبح کا وقت	پگاہ
Very Much, Abundant	بہت زیادہ	بہتیرا

2.5 مشقیں

مشق 1۔ ذیل میں دیے گئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

عقبیٰ : ....

رستگاری : ....

پرکالے : ....

دلی کیفیت: ....

تابوت : ....

مرگ : ....

مشق 2۔ نیچے دیے گئے اشعار کی اپنے الفاظ میں تشریح کیجیے۔

آنسو آنکھوں میں بھر بھر آتے ہیں
دست و پا سارے تھرتھراتے ہیں
دل کو سمجھاتی ہوں میں بہتیرا
پر سنبھلتا نہیں ہے جی میرا

....

....

....

....

2.6 نمونہ امتحانی سوالات

2.6.1 معروضی سوالات:

(1) مرزا شوق کا نام کیا تھا؟

(a) احمد علی (b) تفضل حسین (c) تصدق حسین (d) اکبر حسین

(2) شوق نے کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟

(a) چار (b) سات (c) پانچ (d) تین

(3) مثنوی زہر عشق کس شہر کی ترجمانی کرتی ہے؟

(a) لکھنؤ (b) آگرہ (c) دہلی (d) فیض آباد

(4) کوہ کن کے کیا معنی ہیں؟

(a) پہاڑ کاٹنے والا (b) پہاڑ بنانے والا (c) پہاڑ گرانے والا (d) پہاڑ اٹھانے والا

(5) مرزا شوق کس بادشاہ کے ہم عصر تھے؟

(a) غازی الدین حیدر (b) محمد علی شاہ (c) امجد علی شاہ (d) واجد علی شاہ

(6) فریب عشق کس کی مثنوی ہے؟

(a) میرحسن (b) نسیم (c) سودا (d) شوق

(7) زہر عشق میں کس کا قصہ بیان کیا گیا ہے؟

(a) ایک حسین لڑکی (b) بہادر لڑکے (c) بوڑھی عورت (d) شہزادی

(8) مرزا شوق کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) لکھنؤ (b) فیض آباد (c) دہلی (d) حیدرآباد

(9) ذیل میں سے کون سی مثنوی مرزا شوق کی ہے؟

(a) سحر البیان (b) گلزار نسیم (c) زہر عشق (d) راہ عشق

(10) مرزا شوق کے چچا کس دربار سے وابستہ تھے؟

(a) اودھ (b) دہلی (c) نظام شاہی (d) آصف جاہی

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ''زہر عشق'' کا قصہ مختصر اپنے الفاظ میں لکھیے۔
2. مثنوی ''زہر عشق'' کی خصوصیات پر نوٹ لکھیے۔
3. شیریں و فرہاد کون تھے؟
4. شوق کی دوسری مثنویوں "بہار عشق، فریب عشق" کے بارے میں لکھیے۔
5. زہر عشق میں کس شہر کا عکس نظر آتا ہے۔ چند جملوں میں بیان کیجیے۔

2.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مرزا شوق کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. زہر عشق کا اقتباس پڑھنے کے بعد اس مثنوی کے بارے میں اپنے تاثرات لکھیے۔
3. ایک سے دس تک کے اشعار کی تشریح کیجیے۔

2.6.1 کے جوابات:

(i) C	(ii) D	(iii) A	(iv) A	(v) D
(vi) D	(vii) A	(viii) A	(ix) C	(x) A

اکائی 3: قصیدہ

"ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی" (ذوقؔ)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 قصیدہ "ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی" (ذوقؔ)

3.2.1 ذوق کا تعارف

3.2.2 ذوق کی قصیدہ نگاری

3.2.3 قصیدہ کا متن

3.2.4 قصیدہ کی تشریح

3.3 اکتسابی نتائج

3.4 مشکل الفاظ

3.5 مشقیں

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.0 تمہید

قصیدہ لفظ قصد سے بنا ہے، جس کے معنی کسی کی تعریف و توصیف بیان کرنا ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں قصد یا ارادے سے کسی کی تعریف یا مذمت کی جاتی ہے۔ تعریف ہو تو قصیدہ کہلاتا ہے اور مذمت ہو تو ہجو یہ۔ کئی شعرا نے قصیدہ گوئی میں طبع آزمائی کی لیکن اس صنف میں سب سے زیادہ شہرت مرزا محمد رفیع سودا اور ذوق کے قصائد کو حاصل ہوئی۔ یہ صنف 1857ء کے غدر کے بعد صرف مذہبی موضوعات کے ساتھ منسلک ہو گئی۔ ایک صنف کے طور پر تو باقی رہی لیکن زیادہ استعمال نہیں کی گئی۔ اس اکائی میں ہم بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ذوقؔ کے قصیدے اور اس کی تشریح کا مطالعہ کریں گے۔

3.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- قصیدہ کے معنی کو سمجھ سکیں۔

- قصیدہ کے اجزا کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں۔
- اردو کے مشہور قصیدہ گو شاعر ذوق کے بارے میں جان سکیں۔
- نصاب میں شامل قصیدے کا مطالعہ کر سکیں۔
- شامل نصاب قصیدہ کی تشریح کر سکیں۔

3.2 قصیدہ "ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی" (ذوقؔ)

قصیدہ عربی لفظ ہے جس کے معنی ''گاڑھا مغز'' کے ہیں۔ اس صنف کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ اور پر شکوہ مضامین کی وجہ سے تمام اصناف سخن میں ممتاز ہے اور تمام اصناف میں اسے وہی اہمیت حاصل ہے جو انسانی جسم میں مغز سر یعنی دماغ کو حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے مغز تصور کر کے قصیدہ کا نام دیا گیا ہے۔ قصیدے میں غزل کے برخلاف خیالات اور مضامین مربوط ہوتے ہیں اس لیے اسے عنوانات سے مزین کیا جاتا ہے۔ جیسے ''درمنقبت حضرت علیؑ''، ''درمنقبت امام رضا''، ''در مدح عالم گیر ثانی'' اور ''در مدح آصف الدولہ'' وغیرہ۔ اس کے علاوہ قصائد کو قافیے کے آخری حرف کی مناسبت سے مخصوص نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مثلاً قصیدہ لامیہ، کافیہ، اور میمیہ وغیرہ۔

اٹھ گیا بہمن ودے کا چمنساں سے عمل
تیغ اردی سے کیا باغ خزاں مستاصل

(قصیدہ لامیہ)

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک
جوں شمع زندگانی ہے میری زباں تک

(قصیدہ کافیہ)

عربی قصیدے کا موضوع بہت وسیع تھا۔ اس میں شاعروں کے ذاتی تجربات واحساسات اور روز مرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات، حالات اور مسائل کے علاوہ مناظر فطرت اور واردات عشق کے بیانات بھی شامل تھے۔ لیکن اردو میں صرف مدح یا ذم کے مضامین سے قصیدہ نگاروں نے سروکار رکھا ہے۔ ایسا قصیدہ جس میں کسی شخص کی برائی کی جائے یا اس کے معائب کی طرف اشارے ہوں ہجویہ قصیدہ کہلاتا ہے۔ سودا کا قصیدہ ''تضحیک روزگار'' ہجو کی ایک عمدہ مثال ہے اس میں شخصی ہجو کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی زبوں حالی کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے۔ قصیدے کو موضوع کے اعتبار سے مختلف قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(1) تمہیدیہ (2) خطابیہ (3) مدحیہ (4) ہجویہ (5) وعظیہ
(6) بیانیہ (7) بہاریہ (8) عشقیہ

قصیدے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

(1) تشبیب (2) گریز (3) مدح (4) مدعا ودعا

قصیدے کے ابتدائی یا تمہیدی اشعار کو اصطلاح میں تشبیب کہا جاتا ہے۔ تشبیب میں مختلف موضوعات مثلاً دنیا کی بے ثباتی، علوم وفنون کی بے قدری، پند وموعظت، شاعری کی تعریف اور موسم بہار کی مرقع کشی وغیرہ پیش کیے جاتے ہیں۔ تشبیب کا مقصد تمہید کے ذریعے سے مدح کے لیے ایک خوشگوار فضا تیار کرنا بھی ہے تاکہ ممدوح کی توجہ شاعر کی طرف رہے اور وہ اپنی تعریف وتوصیف سن کر خوش ہو اور قصیدہ گو کو انعام واکرام سے سرفراز کرے۔ گریز جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، قصیدے میں تشبیب اور مدح کے درمیان ایک منطقی رابطے اور کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ تشبیب سے گریز کرکے شاعر مدح کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دعا قصیدہ کا اختتامی حصہ ہوتا ہے جس میں شاعر اپنے ذاتی حالات اور اغراض ومطالب بیان کرتا ہے۔ آخر میں ممدوح کو دعا دی جاتی ہے کہ بخشش ونوازش کرنے والا ممدوح ہمیشہ خوش وخرم رہے۔ اردو کے مشہور قصیدہ گو شعرا میں نصرتی، سودا، ذوق، مومن اور امیر مینائی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ہجو یہ قصیدے میں کسی شخص کی تعریف وتوصیف کی جگہ ذم کا پہلو لے لیتا ہے۔

3.2.1 ذوقؔ کا تعارف:

شیخ ابراہیم نام اور ذوق تخلص تھا۔ 1203ھ مطابق 1788ء میں پیدا ہوئے۔ والد شیخ محمد رمضان ضلع مظفر نگر (یوپی) کے رہنے والے تھے۔ تلاش روزگار میں دہلی آئے اور نواب لطف علی خاں کی محل سراء میں ملازم ہو گئے۔

ذوق نے دہلی میں ابتدائی تعلیم گھر پر پائی اور بعد میں حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں داخل ہوئے۔ حافظ غلام رسول شوق کو شعر وشاعری سے دلچسپی تھی۔ ذوق بھی فطری مناسبت اور اسی دور کے مذاق کے مطابق شاعری کے قریب ہوئے۔ اپنے استاد شوق سے ملتا جلتا تخلص ذوق اختیار کیا اور باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ مکتب کی تعلیم کے بعد مولوی عبدالرزاق کی مدد سے مدرسے میں داخل ہوئے جہاں مولوی محمد باقر اور میر کاظم حسین بیقرارؔ کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ حصول علم کے ساتھ شعر وشاعری کا شغل جاری رہا۔ ابتدائی ایام میں بھی قصائد لکھے۔ اس وقت بطور شاعر شاہ نصیر کی شہرت بہت زیادہ تھی ذوق ان کی شاگردی میں داخل ہوئے۔ کچھ دنوں بعد ان سے علاحدہ ہو گئے۔ کوشش، سعی، جستجو اور اپنے دوست میر کاظم حسین کے توسط سے ولی عہد بہادر شاہ ظفر تک ان کی رسائی ہو گئی۔ ولی عہد کے اشعار کی اصلاح کی خدمت ذوق کے سپرد ہوئی۔ شاعرانہ مہارت میں اضافہ نے شہرت میں اضافہ کیا۔

انہوں نے کبھی اپنے ممدوح بہادر شاہ ظفر کے دربار کو چھوڑ کر کسی دوسرے دربار کا رخ نہیں کیا اور مغل سلاطین کے علاوہ کسی دوسرے والیٔ ریاست کی تعریف کی نہ قصیدہ لکھا۔ بادشاہ کے استاد ہوئے ملک الشعرا کا خطاب پایا۔ اردو کے قصیدہ نگار شعرا میں سودا کے بعد انہیں کا نام لیا جاتا ہے۔ 1271ھ مطابق 1854ء میں ان کا انتقال ہوا۔

3.2.2 ذوق کی قصیدہ نگاری:

اردو قصیدے کی تاریخ میں شیخ ابراہیم ذوق کی قصیدہ نگاری منفرد اہمیت رکھتی ہے۔ انہیں قصیدہ نگار کے طور پر غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی جب کہ وہ ایک اچھے غزل گو بھی تھے۔ ان کے مطبوعہ قصائد کی تعداد 25 ہے۔

ذوق کے قصائد کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے حمدیہ، مذہبی، منقبتی قصائد نہیں لکھے صرف ایک قصیدہ سید عاشق نہال چشتی کی مدح میں ملتا ہے۔ ان کے قصیدے اکبر شاہ ثانی یا بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ملتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی ولی عہدی کے زمانے ہی سے ان کا ربط اور استادی قائم ہو چکی تھی۔ ذوق نے اس تعلق کو زندگی بھر نبھایا۔ کسی اور کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا اور دربار شاہی میں پڑھے جانے

والے مدحیہ قصائد کے علاوہ کسی اور موضوع پر قلم نہیں اٹھایا اور انہیں اپنی قوت فکر، علوے تخیل، وسعت مطالعہ، مہارت زبان اور قدرت بیان، جدت طرازی اور ندرت فکر واسلوب کا مظاہرہ کیا۔ دربار کے ہر جشن اور خاص تقریبات پر قصائد لکھتے تھے۔

ذوق نے اپنے قصائد میں بہترین اور لاجواب مطلعے پیش کیے ہیں۔ انہیں مطلع کہنے سے بڑی دلچسپی تھی۔ اس میں انہوں نے اپنے فن کارانہ اور شاعرانہ شعور کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

ذوق کی تشبیب عام طور پر عالمانہ، فن کارانہ اور استادانہ نظر آتی ہے۔ بہاریہ تشبیب میں انہوں نے ایسی تصویریں پیش کی ہیں جو ان کے فکر وفن کا بہترین نمونہ کہی جاسکتی ہیں تاثرات بہار کی پیکر تراشی میں انہوں نے تشبیہ، استعارہ، مبالغہ آرائی سے وہ کیفیت پیدا کی ہے کہ اس کی دل کشی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ساتھ ہی انہیں اخلاقی نظریات وحکیمانہ خیالات سے بھی دلچسپی تھی۔ اسی لیے اخلاقی صداقتوں کو فن کارانہ خوبصورتی اور حسن بندش کے ساتھ نظم کرنا ان کا محبوب شغل تھا۔ شبابیہ اور عشقیہ خیالات کے ساتھ ان کا حکیمانہ شعور معنویت اور بلاغت کا ترجمان نظر آتا ہے۔ اپنے ایک قصیدہ میں انہوں نے قلم کی تعریف تشبیب کے طور پر پیش کی ہے جو قابل تعریف ہے۔ مختصراً ان کے قصائد میں تشبیب عام طور پر جامع، متنوع، پراثر اور فن کارانہ پائی جاتی ہے۔

گریز قصیدہ کا وہ حصہ ہے جہاں شاعر تشبیب سے مدح کی جانب توجہ کرتا ہے اس میں شاعر کو نزاکت خیال اور حسن ادا سے کام لینا پڑتا ہے۔ ذوق کے پاس بات سے بات پیدا کرنے کے انداز کو برتا گیا ہے اس سے حسن پیدا ہو گیا ہے۔ ذوق نے مدح خوانی وستائش میں ان تمام روایتی خصوصیات کو سامنے رکھا ہے جو سلاطین وامرا کی مداحی کے لیے فارسی قصیدہ نگاری میں برتی گئی ہیں۔

ذوق نے فارسی قصیدہ نگاری اور سودا کے قصائد کی مدد سے اپنے ممدوحین کی شان وشوکت، جاہ وجلال، قہر ومہر، عدل وانصاف اور خسروانہ کردار کی تعریف وتوصیف میں قدرت بیان اور شوکت الفاظ کا مظاہرہ کیا۔ بہادر شاہ ظفر کی صفات شاہانہ کے ساتھ عالمانہ حقائق اور بزرگانہ فضائل کا ذکر بھی ذوق کے پاس ملتا ہے اس سے قصائد میں اثر آفرینی پیدا ہوتی ہے۔ قصائد میں شخصی تعریف کے ساتھ ہاتھی، گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی کی جاتی تھی ذوق نے اس روایت سے بھی استفادہ کیا اور نئی نئی مبالغہ آفریں تشبیہات واستعارات سے ان کی پیش کشی کا اہتمام کیا۔

قصیدہ میں مدح کے بعد حسن طلب کی باری آتی ہے۔ ذوق نے اپنے اکثر وبیشتر قصائد میں حسن طلب کے بجائے دعائیہ اشعار نظم کیے اور اس کے لیے مختلف پیرائے بیان اختیار کیے ہیں جس سے ان کے انداز سخن کی اختراعی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔

3.2.3 قصیدہ "ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی" کا متن (انتخاب):

ساون میں دیا، پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عید آئی، قدح کش کی بن آئی
کرتا ہے ہلال ابروے پر خم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی
ہے عکس فگن جام بلوریں سے مے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ مے کش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی
یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ ممیز کرہ ناری و مائی
پہنچا کمک لشکر باراں سے ہے یہ زور
ہرنالے کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی
ہو قلزم عماں پہ لب جو متبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی
ہے کثرت باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جو زمیں پائی
سردی حنا پہنچے ہےعاشق کے جگر تک
معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دست حنائی
عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی
کیا صرف ہوا ہے طرب وعیش کا عالم
ہے مدرسہ میں بھی سبق صرف ہوائی
خالی نہیں مے سے روش دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانہ تسبیحِ ریائی
جو آئینہ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینائے مے کاہ روبائی
کرتی ہے صبا آکے، کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے، کبھی لخلخہ خائی
تھا سوزنی خار کا، صحرا میں جہاں فرش
سبزہ نے وہاں مخمل خوش رنگ بچھائی
آرائش گلشن کے لیے جامہ رنگیں
زیبائش غنچہ کے لیے تنگ قبائی
ہے نرگس شہلانے، دیا آنکھ میں کاجل

برگ گل سوسن نے دھڑی لب پہ جمائی
ابرو پہ کرے قوس قزح وسمہ، تو خورشید
سرخی شفق سے کرے ریش اپنی حنائی
رخسارۂ گل چیں کا ہے، سرخی سے یہ عالم
جوں وقت غضب چہرہ ترکان خطائی
کیا ساغر رنگیں کوکیا جلد مہیا
نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں اک ساغر گل کی
شاخ گل احمرکی نزاکت سے کلائی
اعجاز نوا سنجی مطرب سے چمن میں
ہرشاخ کی ہے نوکِ زبان شعرنوائی
حیرت کی نہیں جائے کہ دیوار چمن پر
ہرطائر تصویر کرے نغمہ سرائی
شاہا! ترے جلوے سے ہے یہ عید کی رونق
عالم نے تجھے دیکھ کے ہے عید منائی
کہتے ہیں مہ نو جسے ابرو نے وہ تیرے
کی آئینہ چرخ میں ہے عکس نمائی
پرتو سے ترے جام مئے عیش سربزم
لے ساغر جمشید کرے کارروائی
ٹپکے لب ساغر سے وہ قطرہ کروی شکل
ہومثل فلک جس میں تماشائی خدائی
کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے
دریا کی کہاں ہوسکے کاسہ میں سمائی
پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلع موزوں
احسنت، کہیں سن کے بہائی وسنائی
یوں کرسی زرپر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سرحل طلائی

3.2.4 قصیدہ کی تشریح:

بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھے گئے قصیدے "ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی" میں ذوق نے عید اور ساون کی ایک ساتھ آمد پر ان سے لطف اندوزی کی کیفیات کا بیان نہایت ہی شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ موسم برسات ہندوستان کا موسم بہار ہے۔ ہمارا ملک زرعی ملک ہے،۔ وقت پر برسات کی آمد بجائے خود عید کے مماثل ہوتی ہے اس کے ساتھ عید الفطر جیسی مبارک اور متبرک عید اسی موسم میں واقعی ہوئی۔ رمضان کی دینی مصروفیات کے اختتام پر جشن عید کے ساتھ برسات کی بہاریں شاعر کے دل کی کلی کو کھلاتی نظر آتی ہیں۔

شاعر کہتا ہے ہلال عید اپنے ابروئے پرخم سے محفل بادہ کو سجانے کا اشارہ کررہا ہے۔ بلوریں جام سے چھلکتی شراب پُر فضا اور پُر سرور ماحول کی تشکیل کا پیام دے رہی ہے۔ چمکتی بجلی سارے ماحول کو منور کررہی ہے۔ دل اس روشنی میں بھی سرور محسوس کررہا ہے۔ بارش کی شدت نے ندی، نالوں کو تالاب اور تالاب کو سمندر بنادیا ہے۔ یہاں شاعر مبالغہ آمیز انداز میں منظر کشی کررہا ہے وہ کہتا ہے کہ کافور سردی کے اثر کو دور کرتا ہے لیکن بارش کی کثرت سے کافور کی تاثیر چلی گئی ہے۔ مہندی سرد اثر رکھتی ہے۔ معشوق کا دست حنائی عاشق کے جگر کی حدت کو ختم کرتے ہوئے ٹھنڈک پہنچارہا ہے۔ محاورہ کا استعمال کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ سورج کا دیدہ ہوائی ہوگیا ہے۔ مدارس میں بھی یہی سبق پڑھایاجارہاہے خوشگوار ہوا کے جھونکے پر کیف ہیں۔ زمین کا ہر خطہ سبزہ سے ڈھکا ہوا ہے۔ مختلف قسم کے پھول اپنی بہار دکھارہے ہیں۔ خوبصورت ماحول پرندوں کو نغمہ سرائی پر مجبور کررہا ہے اور وہ چہچہا رہے ہیں اس ساری رونق کا نقط عروج شاہ ہندوستاں بہادر شاہ ظفر کا چہرہ مبارک ہے جسے دیکھ کر لوگ عید مناتے ہیں۔ مہ نو کچھ اور نہیں بلکہ بادشاہ کے ابرو ہیں بادشاہ کا عکس جام جمشید کی خصوصیات کا حامل ہے جس کی علمیت اور تدبر افلاک کے لیے وجہ حیرت ہے انہیں خصوصیات کی وجہ سے وہ بے مثال ہے اور شاعر مدح میں قصیدہ کا مطلع ثانی پیش کرنے کی اجازت طلب کرتا ہے اور اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ مطلع ثانی سن کر بہائی وسنائی جیسے عظیم الشان شعرا بھی تعریف کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

شاعر بادشاہ کی مدح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زرین کرسی پر تو جلوہ افروز ہے جیسے کلام پاک کو اس کی بزرگی کی وجہ سے سونے کے رحل پر رکھاجاتا ہے تو اے بادشاہ جس کی سخاوت وہدایت کے سامنے ایک دنیا گدائی کرنے پر مجبور ہے حالات کو قابو میں رکھنے کی تجھ میں ایسی صلاحیت حاصل ہے جو تیرے دشمن کو کامیاب ہونے نہیں دیتی۔ اگر آسمان ترے آگے ماتھا رگڑے، سجدہ کرے تو سورج سے زیادہ روشن نشان حاصل کرے اس کے بعد ید بیضا اور کوہ صفا کی تلمیحات استعمال کرتے ہوئے شاعر بہادر شاہ ظفر کے بلند مقام ومرتبہ کا بیان کرتا ہے اور بہادر کی شاعرانہ عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے ہر سال شان وشوکت سے عید منانے کی دعا دیتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہے۔

ذوق کی شاعرانہ استادی مسلم ہے۔ ان کو قصیدہ کا استاد ماناجاتا ہے، الفاظ کی شان وشوکت، ترکیبوں کی دلآویزی اور بندش کی چستی سے انہوں نے اس معمولی سی بات میں جان ڈال دی ہے۔ ذوق کا قصیدہ قدیم رنگ ومعیار شاعری میں ڈھلا محسوس ہوتا ہے۔ ذوق نے اپنی زندگی میں ایک ادارہ کی حیثیت حاصل کرلی تھی۔ ان کے بارے میں پروفیسر تنویر احمد علی مرتب کلیات ذوق لکھتے ہیں:

"ذوق اپنے مخصوص انداز بیان، منفرد لہجہ اور خاص لفظیات کے ساتھ اردو قصیدہ نگاروں میں ایک ممتاز مقام کے حامل شاعر ہیں۔"

3.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ”گاڑھا مغز“ کے ہیں۔ اصطلاح میں اس صنف شاعری کو کہا جاتا ہے جس میں کسی کی تعریف یا مدح کی جائے۔
- موضوع کے لحاظ سے قصیدے کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں (1) تمہیدیہ (2) خطابیہ (3) مدحیہ (4) ہجویہ (5) وعظیہ (6) بیانیہ (7) بہاریہ (8) عشقیہ، زیادہ مشہور ہیں۔
- قصیدے کے اجزائے ترکیبی میں (1) تشبیب (2) گریز (3) مدح (4) مدعا و دعا، شامل ہیں۔
- ذوقؔ نے قصیدہ ”ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی“ بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں لکھا تھا۔
- ذوق کا تعلق بہادر شاہ ظفر کے دربار سے تھا۔ ایک بار عید الفطر اور ساون کا مہینہ ایک ساتھ آیا۔ ذوق نے اسی مناسبت سے دربار میں قصیدہ سنایا اور ساون اور عید الفطر کی رنگینیوں کا بیان اثر آفرین انداز میں کیا۔

3.4 مشکل الفاظ

اختراعی قوت	نئی چیز بنانے کی صلاحیت	Creative Power, Ability To Invent
اثر آفرینی	اثر پیدا کرنا	Producing Effect, Creating Impact
شوکت الفاظ	الفاظ کی مناسب ترتیب و تنظیم	Grandeur Of Words, Pomp Of Words
عکس فگن	عکس ڈالنے والا، وہ جس کا عکس دکھائی دے	Image Creator, One Whose Reflection Is Visible
نوا سنجی	گیت گانا، گانا سنانا	Singing Songs, Reciting Songs
گلِ احمر	گلاب کا پھول	Red Rose
پرتو	عکس، سایہ	Light, Reflection, Shadow
رحل طلائی	سونے کی بنی ہوئی رحل	Golden Book Stand (Rehal)
مصحف	کتاب، صحیفہ مراد قرآن	Book, Scripture (Refers To Quran)
بھائی و سنائی	فارسی زبان کے دو مشہور شاعر	Famous Persian Poets
قدح	بڑا پیالہ	Large Cup, Goblet
حنائی	مہندی لگے، سرخ	Henna-Colored, Reddish
باراں	بارش	Rain
عماں	ایک سمندر کا نام، ایک شہر کا نام	Name of A Sea or A City

لخلخہ	خوشبودار چیزوں کا مجموعہ	Collection Of Fragrant Items
ریائی	ظاہر داری، مکر و فریب	Showiness, Superficial Display
جو	ندی، نہر	River, Stream
بادہ	شراب	Wine
جام بلوریں	صاف شفاف، چمکدار پیالہ، کانچ کا ساغر، پیمانہ	Crystal Goblet, Transparent Cup
ممیز	بھلے برے کی پہچان، تمیز	Discriminator, One Who Distinguishes Good From Bad
ناخن شمشیر	تلوار کی دھار	Sword Blade
سنائی	فارسی کا مشہور شاعر	Famous Persian Poet
قلزم	وہ بحیرہ جو عرب اور مصر کے درمیان واقع ہے، نہایت گہرا سمندر۔	Deep Sea Between Arabia And Egypt
ناصیہ سائی	ماتھا رگڑنا، خوشامد کرنا	Rubbing Forehead, Flattery
ید بیضا	حضرت موسیٰ کا معجزہ۔ روشن اور چمکدار ہاتھ	Miracle Of Prophet Moses, Shining Hand
سیمرغ	ایک خیالی پرندہ جس کا وطن کوہ قاف بتایا جاتا ہے۔	Mythical Bird From Persian Literature, From Mount Qaf
کوہ صفا	صفا اور مروہ، مکہ معظمہ کے نزدیک دو مقدس پہاڑیاں	Sacred Hills Near Mecca (Safa & Marwah)

3.5 مشقیں

مشق 1: قصیدے کے اجزا کے بارے میں چند جملے لکھیے۔

(1) تشبیب: ....

(2) گریز: ....

(3) مدعا: ....

(4) دعا: ....

مشق 2: نیچے دیے گئے اشعار کی تشریح کیجیے۔

عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

....

....

....

کیا صرف ہوا ہے طرب وعیش کا عالم
ہے مدرسہ میں بھی سبق صرف ہوائی

....

....

....

3.6 نمونہ امتحانی سوالات

3.6.1 معروضی سوالات:

1۔ لفظ قصیدہ کس لفظ سے بنا ہے؟

(a) قصد (b) قسد (c) قشد (d) قثد

2۔ قصیدہ کس زبان کا لفظ ہے؟

(a) ہندی (b) اردو (c) عربی (d) فارسی

3۔ ذوق کا پورا نام کیا ہے؟

(a) شیخ اسمٰعیل (b) شیخ محمد رمضان (c) شیخ ابراہیم (d) غلام رسول

4۔ ذوق کا انتقال کب ہوا؟

(a) 1788 (b) 1890 (c) 1869ء (d) 1872

5۔ ذوق نے کس بادشاہ کی شان میں قصیدہ لکھا؟

(a) جہانگیر (b) بہادر شاہ ظفر (c) اکبر (d) تیمور

6۔ ذوق کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) شیخ محمد رمضان (b) شیخ معظم (c) شیخ حزیں (d) شیخ سلیم

7۔ ذوق کے مطبوعہ قصائد کی تعداد کتنی ہے؟

(a) بارہ (b) بتیس (c) پچیس (d) بیالیس

8۔ ذوق کو دربار سے کیا خطاب ملا؟

(a) شمس العلما (b) طوطی ہند (c) خاقانی ہند (d) ملک الشعرا

9۔ مہ کے کیا معنی ہیں؟

(a) چاند (b) سورج (c) ستارے (d) آسمان

10۔ ذوق کے والد کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) لکھنؤ (b) مظفر نگر (c) آگرہ (d) دہلی

3.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. ذوق کے حالات زندگی بیان کیجئے۔
2. قصیدہ کے لغوی واصطلاحی معنی بیان کیجیے۔
3. عید اور ساون کے حوالے سے ذوق نے قصیدے میں کیا باتیں کہی ہیں؟
4. اس شعر کا مطلب لکھیے۔

کرتا ہے ہلال ابروے پر خم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

5. ذوق نے یہ قصیدہ کس کے بارے میں لکھا ہے؟

3.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. قصیدہ کی تعریف کرتے ہوئے اس کے اجزا کی وضاحت کیجیے۔
2. ذوق کی قصیدہ نگاری کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. قصیدہ در مدح بہادر شاہ ظفر کا خلاصہ لکھیے۔

3.6.1 کے جوابات:

(i) A	(ii) C	(iii) C	(iv) A	(v) B
(vi) A	(vii) C	(viii) D	(ix) A	(x) B

اکائی 4: قصیدہ

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام (مرزا غالب)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 قصیدہ: ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام (مرزا غالب)

4.2.1 مرزا غالب کا تعارف

4.2.2 مرزا غالب کی قصیدہ گوئی

4.2.3 قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" (منتخب متن)

4.2.4 تشریح

4.3 اکتسابی نتائج

4.4 مشکل الفاظ

4.5 مشقیں

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.0 تمہید

قصیدہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ قصیدے میں عام طور پر کسی بادشاہ یا امیر کی تعریف بیان کی جاتی ہے۔ بادشاہوں کے علاوہ بزرگانِ دین کی منقبت میں بھی قصیدے لکھے گئے ہیں۔ قصیدے کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے، جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ لایا جاتا ہے۔ باقی اشعار میں غزل کی طرح صرف دوسرے مصرعے میں قافیے کی پابندی کی جاتی ہے۔ قصیدہ چار حصوں پر مشتمل ہوتا ہے، جنہیں قصیدے کے اجزائے ترکیبی کہتے ہیں، جو یہ ہیں:

(1) تشبیب (تمہید) (2) گریز (3) مدح (4) دعا / مدعا

تشبیب وہ اشعار ہوتے ہیں، جو قصیدے کے شروع میں بہ طور تمہید کہے جاتے ہیں۔ ان میں بہار و شباب، حسن و عشق اور حکمت و فلسفہ وغیرہ سے متعلق مضامین بیان کیے جاتے ہیں۔ ان اشعار کا مقصد سامع یا قاری کو اصل موضوع کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ تمہیدی اشعار کے بعد اصل موضوع یعنی مدح کی طرف آنے کی غرض سے جو اشعار کہے جاتے ہیں انہیں گریز کہا جاتا ہے۔ قصیدے کا یہ حصہ نہایت مختصر ہوتا ہے۔ گریز کے اشعار ایسے ہوتے ہیں، جن سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ بات سے بات نکلی اور بادشاہ یا رئیس کی مدح کا قرینہ نکل آیا۔

گریز کے بعد مدح کا حصہ ہوتا ہے۔ مدح کے معنی تعریف و توصیف کے ہیں۔ مدح قصیدے کا اصل جزو ہوتا ہے۔ اس حصے میں ممدوح کی ذات اور اس کے اوصاف کا بیان ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ممدوح کے جاہ و جلال، شان و شوکت، عدل وانصاف، بہادری و شجاعت، دریا دلی و سخاوت، لشکر اور سپہ، ہاتھی، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کی پر شکوہ انداز میں مبالغے کے ساتھ تعریف کی جاتی ہے۔ قصیدے کے آخر میں شاعر ممدوح کی صحت و سلامتی، عمر کی درازی اور شان و شوکت کی برقراری کے لیے دعا کرتا ہے۔ بعض اوقات شاعر دعا سے قبل ممدوح سے انعام واکرام اور صلہ و بخشش کی درخواست بھی کرتا ہے، جسے مدعا یا حسن طلب کہتے ہیں۔

قصیدے میں شاعر اپنے زور بیان، تخیل کی بلندی اور علم و فضل کا اظہار کرتا ہے۔ بھاری بھرکم اور پر شکوہ الفاظ، نادر تشبیہات و استعارات، مشکل تراکیب، مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات، لہجے کا طمطراق اور بلند آہنگی قصیدے کے لوازمات میں شامل ہیں۔ قصیدے میں اشعار کی تعداد کم سے کم پندرہ اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو تک ہوتی ہے۔

عام طور پر قصیدے میں تعریف و توصیف اور مدح کی جاتی ہے، لیکن کبھی کبھی اس میں کسی کی مذمت یا ہجو بھی کی جاتی ہے۔ ایسے قصیدے کو ہجویہ قصیدہ کہتے ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا، شیخ ابراہیم ذوق، مصحفی، انشا، غالب، محسن کاکوروی وغیرہ اردو کے اہم قصیدہ گو شعرا ہیں۔ اس اکائی میں ہم اردو کے مشہور شاعر مرزا غالب کے ایک قصیدے کا مطالعہ کریں گے جو مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہے۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مرزا غالب کا تعارف پیش کر سکیں۔
- مرزا غالب کی قصیدہ گوئی کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" کے منتخب اشعار کی قرات کر سکیں۔
- قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" کے منتخب متن کی تشریح کر سکیں۔

4.2 قصیدہ: ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام (مرزا غالب)

4.2.1 مرزا غالب کا تعارف:

مرزا غالب اردو کے عظیم شاعر اور بلند مرتبت نثر نگار تھے۔ انہوں نے اردو غزل میں نئے موضوعات اور نئے مضامین داخل کر کے اس کا دامن وسیع کر دیا۔ غالب کا نام مرزا اسد اللہ خاں اور عرفیت مرزا نوشہ تھی۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظام جنگ کے خطابات عطا کیے تھے۔ غالب 27 دسمبر 1797 کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عبد اللہ بیگ خاں اور دادا کا نام قوقان بیگ خاں تھا۔ قوم کے اعتبار سے وہ ایک سلجوقی ترک تھے۔ غالب فخر سے کہتے تھے کہ ان کا سلسلہ نسب توران کے بادشاہ افراسیاب سے ملتا ہے۔ قوقان بیگ مغل بادشاہ شاہ عالم ثانی کے عہد میں سمرقند سے دہلی آئے اور بادشاہ کے ملازم ہوئے۔ غالب کے والد عبد اللہ بیگ خاں بھی دہلی میں پیدا ہوئے، لیکن وہ دلی چھوڑ کر اکبر آباد (آگرہ) میں جا رہے، کیوں کہ ان کی شادی

آگرہ میں خواجہ میرزا غلام حسین کمیدان کی بیٹی عزت النسابیگم سے ہوئی تھی۔ عبد اللہ بیگ خاں ریاست الور کے راجا بختیاور سنگھ کے ملازم ہوئے۔ 1801 میں وہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ ان کے انتقال کے بعد چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے غالب کی پرورش کی ذمہ داری سنبھالی۔ وہ اکبر آباد (آگرہ) کے صوبے دار تھے۔ غالب صرف نو برس کے تھے کہ ان کے چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ انگریز سرکار کی طرف سے مرحوم کے وارثوں کو پنشن مقرر ہو گئی۔

غالب کا بچپن ننھیال میں گزرا۔ ان کے والد بھی گھر داماد کی حیثیت سے آگرے میں اپنی سسرال میں رہتے تھے۔ والد اور چچا کی وفات کے بعد بھی غالب کا بچپن لاڈ پیار میں گزرا، کیوں کہ سرکاری وظیفہ بھی تھا اور دولت مند ننھیال کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ اس کے علاوہ راجا الور نے بھی عبد اللہ بیگ خاں کے خاندان کی پرورش کے لیے وظیفہ مقرر کیا تھا اور دو گاؤں بھی عطا کیے تھے۔ غالب نے آگرہ میں محمد معظم کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے فارسی کی تعلیم محمد معظم سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ دیگر اساتذہ سے اس دور میں رائج بعض کتابیں پڑھیں۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی ذہانت عطا کی تھی اور حافظہ بھی کمال کا پایا تھا۔ جو پڑھ لیتے وہ محفوظ ہو جاتا تھا۔ انہیں فارسی زبان اور شعر و سخن سے بے حد لگاؤ تھا۔ انہیں اپنی فارسی دانی پر بڑا ناز تھا۔

1810 میں غالب کی شادی مرزا الٰہی بخش معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی، جو ان کی چچی کی بھتیجی (بھائی کی بیٹی) تھیں۔ شادی کے بعد غالب دہلی آتے جاتے رہے۔ 1815 میں انہوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ دہلی آنے کے بعد ان کی زندگی اور مزاج میں بڑی تبدیلی آئی۔ اب تک وہ اپنے اخراجات کی طرف سے بے پرواہ تھے۔ ننھیال میں رہتے تھے، جو بہت خوش حال تھی۔ دہلی آکر ان کی آمدنی کا واحد ذریعہ وہ وظیفہ تھا، جو انہیں انگریز گورنمنٹ سے ملتا تھا۔ غالب نے محسوس کیا کہ جو پنشن سرکار نے ان کے خاندان کی مقرر کی ہے اس قدر ملتی نہیں ہے۔ پنشن کی کارروائی کے لیے وہ لکھنؤ سے ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور انگریز سرکار سے درخواست کی کہ انہیں پوری پنشن ملنی چاہیے، لیکن انگریز سرکار نے ان کی درخواست منظور نہیں کی۔

غالب کی زندگی کا بیشتر حصہ تنگ دستی اور مالی پریشانیوں میں گزرا۔ 1850 میں وہ مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں باریاب ہوئے۔ بادشاہ نے ان سے خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کی فرمائش کی اور خطابات کے علاوہ پچاس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ 1854 میں جب بہادر شاہ ظفر کے استاد ذوقؔ کا انتقال ہوا تو وہ غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ 1857 کے ہنگامے میں غالب گوشہ نشین ہو گئے۔ انہوں نے غدر کے حالات فارسی میں پر ایک رسالہ "دستنبو" کے نام سے لکھا۔ یہ زمانہ غالب کے لیے سخت مالی پریشانیوں کا زمانہ تھا۔ پنشن بند تھی اور گزارے کی کوئی صورت نہیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد پنشن تو بحال ہو گئی، لیکن ان کی معاشی حالت درست نہ ہو سکی۔ آخری عمر میں غالب سماعت سے محروم ہو گئے تھے۔ حافظہ بھی جواب دینے لگا تھا۔ وہ بیک وقت کئی امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ تنگ دستی اور بیماریوں سے جھوجھتے ہوئے وہ 15 فروری 1869 کو وفات پا گئے۔

غالب اردو اور فارسی کے زبردست شاعر تھے۔ انہوں نے بارہ برس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔ شاعری میں وہ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ اردو اور فارسی میں انہوں نے کئی شعری اور نثری تصانیف چھوڑی ہیں۔ اردو تصانیف میں دیوان شاعری کے علاوہ نثر میں خطوط کے مجموعے عود ہندی، اردوئے معلیٰ، نکات غالب واقعات غالب، انشائے غالب، نامہ غالب، تیغ تیز کے علاوہ منظوم لغت، قادر نامہ شامل ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے اردو خطوط کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ فارسی میں کلیات شاعری کے علاوہ پنج آہنگ،

مہر نیم روز، دستنبو، قاطع برہان، درفش کاویانی، سبد چیں، باغ دُودر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

4.2.2 مرزاغالب کی قصیدہ گوئی:

اردو غزل میں غالب کا مقام نہایت بلند و بالا ہے۔ عام طور پر میر تقی میرؔ کے بعد غالب ہی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے۔ جہاں تک قصیدہ نگاری کا تعلق ہے غالب نے فارسی میں بہ کثرت قصائد لکھے ہیں، لیکن ان کے اردو دیوان میں صرف چار قصائد ملتے ہیں، جن میں دو حضرت علیؓ کی منقبت میں، اور دو مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ یہ قصیدے بھی دیگر قصیدہ گو شعرا کے قصیدوں کے مقابلے میں مختصر ہیں، لیکن اختصار کے باوجود انہوں نے قصیدے کے اجزائے ترکیبی کی پابندی کی ہے۔ ان چاروں قصیدوں میں تشبیب، گریز، مدح اور دعا کے حصے موجود ہیں۔ ان میں حضرت علیؓ کی منقبت میں جو دو قصائد ہیں ان میں ایک کی تشبیب بہاریہ ہے، یعنی اس میں موسم بہار کی رونقوں کا ذکر ہے اور دوسرے قصیدے کی تمہید میں تصوف اخلاق کے مسائل بیان کیے ہیں۔

غالب نے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو دو قصیدے لکھے ہیں ان میں ایک کی تشبیب میں صبح کی منظر کشی کی گئی ہے اور دوسرے میں مہ نو کو مخاطب کیا ہے۔ ان دونوں قصیدوں کی تشبیہیں اپنی جدت اور دل کشی کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ اردو قصائد میں ایسی خوب صورت تشبیہیں کسی اور قصیدہ گو کے یہاں نہیں ملتی ہیں۔ ان میں الفاظ کی بندش اور بحر کی موزونیت نے بڑا حسن پیدا کر دیا ہے۔ شامل نصاب قصیدے کی تشبیب کے یہ اشعار دیکھیے۔ اس میں غالب نے جدت طبع کا مظاہرہ کرتے ہوئے مہ نو (نئے چاند) سے دلچسپ مکالمہ کیا ہے۔

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام　　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح　　　یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب　　　بندہ عاجز ہے گردش ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا　　　آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا! اے سرور خاص خواص　　　حبذّا! اے نشاط عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے　　　لے کے آیا ہے عید کا پیغام

قصیدے میں تشبیب کی حیثیت تمہید کی ہوتی ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری یا سامع کی توجہ فوراً گرفت میں لے لے۔ زیر مطالعہ قصیدے کی تمہید اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے۔ ہلال عید کی خمیدہ شکل دیکھ کر شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے کے لیے خم ہو گیا ہے۔ چناں چہ وہ سوال کرتا ہے کہ اے مہ نو! تری کمر خم کیوں ہے؟ وہ کون ہے جسے تو آسمان کی بلندی سے جھک کر سلام کر رہا ہے؟ جواب نہیں ملتا تو شاعر کہتا ہے کہ لے مجھ سے سن، اس کا نام بہادر شاہ ہے۔ اس طرح اس قصیدے کی تشبیب میں ایک مکالمے کی صورت اور ڈرامائی شان پیدا ہو گئی ہے۔، جس سے غالب کی ذہانت اور جدت طرازی کا ظہار ہوتا ہے۔

قصیدے میں تشبیب کے بعد گریز کا حصہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ شاعر تشبیب کے آخری اشعار سے بات کا سرا

نکال کر بادشاہ یا رئیس کی مدح کی طرف گھوم جائے اور اس کا انداز ایسا ہو، جس سے تصنع یا بناوٹ نہ جھلکے بلکہ یوں لگے جیسے بات سے بات پیدا ہو گئی۔ گریز ایک شعر کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے اور چند اشعار کے ذریعے بھی۔ گریز کے حسن اور خوبی کے اعتبار سے بھی غالب کے قصائد نہایت عمدہ ہیں۔ انہوں نے قصیدے کے اس جزو کو بھی نہایت سلیقے اور ہنر مندی سے نبھایا ہے۔ ان کے گریز کے پیرائے میں قدرتی انداز اور برجستگی پائی جاتی ہے۔ مثلاً شامل نصاب قصیدے میں مہ نو سے سوال کرتے ہیں:

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا　　ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟

اور پھر خود ہی جواب دیتے ہیں:

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن　　نامِ شاہنشہِ بلند مقام

اس طرح جب بادشاہ کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو اس کی مدح وستائش کا راستہ کھل جاتا ہے۔

قصیدے کا مرکزی جزو مدح ہے، جس میں ممدوح کی تعریف و توصیف اور اس کے اوصاف و محاسن کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ مدح کے لحاظ سے بھی غالب کے قصائد نہایت بہترین ہیں۔ انہوں نے دیگر قصیدہ گو شعرا کے برخلاف مدح میں مبالغہ آرائی کو انتہا تک نہیں پہنچایا ہے، بلکہ ممدوح کے مرتبے کے لحاظ سے اس کی مدح کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قصیدے کے اس جزو کو نہایت سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھ برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کے حضرت علیؓ کی منقبت کے اشعار کا موازنہ بہادر شاہ ظفر کی مدح کے اشعار سے کرتے ہیں تو دونوں میں بڑا واضح فرق محسوس ہوتا ہے۔ حضرت علیؓ کی منقبت ان کی شان کے مناسب ہے اور بادشاہ کی مدح اس کے مرتبے کے موافق۔

غالب نے اپنے قصائد میں ممدوح کے جاہ و جلال، عظمت و شوکت، عدل و انصاف، شجاعت و دلیری، فیاضی و سخاوت لشکر و سپہ، تیر، تلوار یا ہاتھی گھوڑے وغیرہ کی تعریف نہایت خوب صورت انداز میں کی ہے، لیکن اختصار کا خیال ہر جگہ رکھا ہے۔ مدح کے اشعار میں انہوں نے قصیدے کی روایت کے بموجب الفاظ و تراکیب کے شکوہ اور بلند آہنگی کو ملحوظ رکھا ہے۔ غالب کے مدحیہ اشعار کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ انہوں نے مدح میں معمولی چیزوں جیسے شاہی باورچی خانے یا آتش بازی یا معمولی ساز و سامان کا ذکر نہیں کیا ہے جب کہ دوسرے شعرا ان چیزوں کا ذکر نہایت مبالغہ آمیز انداز میں کرتے ہیں۔ شامل نصاب قصیدے میں بھی انہوں نے بادشاہ کے ان اوصاف کا ذکر کیا ہے، جو اس کے شایانِ شان نہیں۔ معمولی اور حقیر چیزوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔

قبلہ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہر ذوالجلال والاکرام

شہسوار طریقہ انصاف　　نو بہار حدیقہ اسلام

جس کا ہر فعل صورت اعجاز　　جس کا ہر قول معنی الہام

بزم میں میزبان قیصر و جم　　رزم میں اُستادِ رستم و سام

اے ترا لُطف زندگی افزا　　اے ترا عہد فرخی فرجام

مرحبا مؤ شگافیِ ناوک! آفریں آبداریِ صمصام
تیر کو تیرے تیر غیر ہدف تیغ کو تیری تیغ خصم نیام
رَعد کا کر رہی ہے کیا دم بند برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیلِ گراں جَسد کی صدا تیرے رخشِ سُبک عناں کا خرِام

عرض مدعا یا حسن طلب اور دعا میں بھی غالب نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ حضرت علیؓ کی منقبت میں جو دو قصیدے ہیں ان میں عرض مدعا کے چند اشعار ہیں، لیکن دعائیہ اشعار نہیں ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی مدح میں جو دو قصیدے ہیں ان میں قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" میں مدعا اور دعا دونوں ہیں، لیکن مدعا یا حسنِ طلب کے اشعار قصیدے کی تشبیب میں ہیں اور دعا کے اشعار آخر میں ۔ بہادر شاہ ظفر کی مدح کا دوسرا قصیدہ "صبح دَم دردازہ خاور کھلا" میں صرف ایک شعر دعائیہ ہے، جو اس قصیدے کا آخری شعر ہے۔ اسی طرح شامل نصاب قصیدے "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" میں بھی دعا کا صرف ایک شعر ہے، جس پر قصیدہ ختم ہوتا ہے۔

ہے ازل سے روائی آغاز ہو ابد تک رسائی انجام

بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں لکھے گئے دونوں مدحیہ قصیدوں میں غالب نے قصیدے کے اشعار کے درمیان غزل بھی شامل کی ہے۔ غالب نے اردو میں صرف چار قصیدے لکھے، لیکن یہ قصائد فنِ قصیدہ گوئی کے لیے سرمایہ فخر کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے قصائد میں قصیدہ گوئی کے سارے لوازمات، زور بیان، فکر کی بلندی، جدت، مبالغہ، سنجیدگی، متانت، الفاظ وتراکیب کا شکوہ، روانی، برجستگی، صنائع و بدائع کا حسن وغیرہ کے ساتھ اختصار اور جامعیت بھی پائی جاتی ہے۔ غالب نے تشبیب میں ندرت اور جدت طرازی کا خوب صورت مظاہرہ کیا ہے۔ مدح میں بہت سی حقیر اور فضول باتوں سے پرہیز کرتے ہوئے انہوں نے قصیدہ گوئی میں ایک نیا انداز اور ایک طرز خاص ایجاد کیا، جو ان کی قصیدہ نگاری کا امتیازی وصف ہے۔

4.2.3 قصیدہ: ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام (منتخب متن):

یہ قصیدہ جس کا ہم مطالعہ کریں گے غالبؔ نے عیدالفطر (رمضان کی عید) کے موقعے پر لکھا تھا۔ اس قصیدے میں شعر نمبر 1 سے شعر نمبر 22 تک تمہید کے اشعار ہیں۔ یہ تمہید قصیدے کی روایتی تمہیدوں سے بالکل مختلف اور الگ ہے۔ اس میں شاعر اور ماہ نو (پہلی تاریخ کا چاند) کے درمیان مکالمہ پیش کیا گیا ہے۔ شعر نمبر 23 سے شعر نمبر 26 تک گریز کے اشعار ہیں جن کے ذریعے تمہید اور مدح میں تعلق پیدا کیا گیا ہے۔ (یعنی شاعر تمہید کے اشعار کا خاتمہ کرکے مدح کے حصے کی طرف آیا ہے) شعر نمبر 26 سے شعر نمبر 28 تک مدح کے اشعار ہیں۔ شعر نمبر 29 سے 34 تک دعا کے اشعار ہیں، جن میں بادشاہ کو دعا دی گئی ہے۔ اس طرح غالبؔ نے اس قصیدے میں صنف قصیدوں کے تمام اجزائے ترکیبی اور دیگر لوازمات کا خیال رکھا ہے۔

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردش ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا! اے سرور خاص خواص — حبذّا! اے نشاط عام عوام
عذرمیں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیاکہ سب نےجان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام
راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کوسمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش — غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو — تب کہا ہے بطرز استفہام
مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ — قرب ہر روز برسبیل دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جزبہ تقریبِ عیدماہِ صیام
جانتاہوں کہ اس کےفیض سےتو — پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، مَیں کون — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سےکیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص — گر تجھے ہے امید رحمت عام
جوکہ بخشے گا تجھ کوفرِ فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مئے گل فام
جب کہ چودہ منازل فلکی — کرچکے قطع تیری تیزی گام
تیرےپرتوسےہوں فروغ پذیر — کوےومشکوےوصحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز — اپنی صورت کااک بلوریں جام
کہہ چکامیں توسب کچھ،اب توکہہ — اےپری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے؟جس کےدرپہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن　　نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلہ چشم و دل بہادر شاہ　　مظہر ذوالجلال و الاکرام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز　　جس کا ہر قول معنی الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم　　رزم میں اوستادِ رستم وسام
جب ازل میں رقم پذیر ہوے　　صفحہ ہاے لیالی و ایام
اوران اوراق میں بہ کلک قضا　　مجملاً مندرج ہوئے احکام
تیری توقیع سلطنت کو بھی　　دی بدستور صورت ارقام
کاتبِ حکم نے بموجب حکم　　اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائی آغاز　　ہو ابد تک رسائی انجام

4.2.4 قصیدہ: ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام (منتخب متن کی تشریح):

یہ قصیدہ غالب نے بہادر شاہ ظفر کی تعریف میں لکھا ہے جو مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ تھے۔ قدیم زمانے میں بادشاہ خاص خاص تقریبوں جیسے شہزادے/شہزادی کی ولادت، سال گرہ، شادی بیاہ یا عیدوں اور تہواروں کے موقع پر جشن مناتے تھے۔ شاہی محلات اور دربار کو سجایا جاتا، بادشاہ دربار منعقد کرتے۔ امرا، درباریوں اور دوسرے ماہرین فن کو انعامات اوراعزازات سے مالامال کیا جاتا۔ شعرا بادشاہ کی تعریف وتوصیف میں قصائد پیش کرتے۔ اِنھیں بھی اعزازاورانعام سے نوازا جاتا تھا۔ اس قصیدے کی تمہید سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصیدہ غالب نے عید الفطر کے جشن کے موقع پر بہادر شاہ ظفر کے دربار میں پیش کیا تھا۔ آیئے اب ہم اس قصیدے کے مطالب کا مطالعہ کرتے ہیں۔

1. ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام　　جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

یہ شعر اس قصیدے کا مطلع ہے۔ مہ نو کے معنٰی ہیں نیا چاند جو قمری مہینے کی پہلی تاریخ کو دکھائی دیتا ہے۔ چوں کہ یہ قصیدہ رمضان کی عید کے موقع پر لکھا گیا ہے اس لیے یہاں مہ نو سے مراد ہلالِ عید ہے جو عید کی خوش خبری لے کر آیا ہے۔ شاعر اُس موقع سے پوچھتا ہے "اے مہ نو! ہمیں بھی اس کا نام بتادے جسے تو جھک کر سلام کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ جب کوئی شخص کسی کو جھک کر سلام کرتا ہے تو اس کی شکل ہلال (پہلی تاریخ کے چاند) کے جیسی ہو جاتی ہے۔

2. دو دن آیا ہے تو نظر دم صبح　　یہی انداز اور یہی اندام

اے مہ نو! تو دو دن تک صبح کے وقت یعنی سورج طلوع سے قبل آسمان پر اسی انداز اور اسی صورت میں یعنی باریک لکیر کی طرح نظر آیا۔ چھبیس اور ستائیس تاریخ کو چاند رات کے پچھلے پہر نظر آتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

3. بارے دودن کہاں رہاغائب؟ بندہ عاجز ہے گردش ایّام

شاعر پوچھتاہے "اے مہ نو! تو دودن تک کہاں غائب رہا؟ چاند جواب دیتا ہے۔ گردش ایام کے آگے میں مجبور اور بے بس ہوں۔ گردش ایام کی وجہ سے میں غائب رہا۔ اگر تیس تاریخ کا چاند ہو تو وہ 28ویں اور 29ویں شب کو بالکل نظر نہیں آتا گویا کہ غائب ہو جاتا ہے۔ شاعر نے یہی پوچھا ہے۔

4. اڑکے جاتا کہاں کہ تاروں کا آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

چاند کہتاہے کہ میں اڑ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں۔ کیونکہ آسمان نے تاروں کا جال بچھا رکھا ہے۔ اگر اڑنے کی کوشش بھی کروں تو تاروں کے جال میں گرفتار ہو جاؤں گا۔ اس لیے میرا چھپنا اور دکھائی دینا وقت کی گردش کی وجہ سے ہے۔ اس پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ ماہِ نو کو ماہی فلک (آسمان کی مچھلی) بھی کہتے ہیں کیونکہ مچھلی بھی ہلال کی سی شکل بناتی ہے۔ مہ نو مچھلی کی طرح تڑپ کر کہیں نکل بھی نہیں سکتا کیونکہ تاروں کا جال پھیلا ہوا ہے جس میں وہ پھنس جائے گا۔

5. مرحبا اے سرور خاص خواص حبّذا اے نشاط عام عوام

6. عذر میں تین دن نہ آنے کے لے کے آیا ہے عید کا پیغام

مرحبا اور حبّذا تحسین اور مبارک باد کے کلمات ہیں۔ ہلالِ عید خاص لوگوں کے لیے سرور کا باعث ہے اور عوام کے لیے بھی خوشی اور مسرت کا سبب ہے۔ یہاں سے شاعر کی گفتگو شروع ہوتی ہے۔ کہتاہے اے مہ نو! تیرا آنا مبارک ہو کہ غیر حاضر رہنے کی معافی کے لیے عید کا پیغام لے کر آیا ہے۔

7. اس کو بھولا نہ چاہیے کہنا صبح جو جائے اور آئے شام

مثل مشور ہے۔" صبح کا بھولا شام کو آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ یعنی آدمی غلطی کر کے فوری اپنی غلطی کو درست کر لے، یا بگڑ کر سدھر جائے تو وہ قابلِ سزا نہیں۔ اس شعر میں اس مثل کو نہایت پر لطف انداز میں نظم کیا گیا ہے۔

چاند دودن آسمان سے غائب رہا یعنی 27 اور 28 تاریخ کو فجر کے وقت نظر نہیں آیا لیکن 30 تاریخ کی شام کو دکھائی دیا۔ یعنی صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹا۔

8. ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا تیرا آغاز اور ترا انجام

صرف میں ہی نہیں ساری دنیا جان چکی ہے کہ تیرا آغاز بھی ہلال ہے اور انجام بھی ہلال ہے۔ تو ہلال سے بدر (چودھویں کا چاند) بنتا ہے اور بدر سے ہلال۔ یہ سلسلہ چلتا ہی رہتا ہے۔

9. راز دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام

10. جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ایک ہی ہے امید گاہ انام

تو اپنے دل کی بات (اپنی امید گاہ) مجھ سے ناحق چھپاتا ہے۔ میں غیبت کرنے والا یا چغل خور نہیں کہ تیرا راز فاش کروں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آج دنیا میں عوام کی ایک ہی امید گاہ ہے جہاں امیدیں پوری ہوتی ہیں جو بادشاہ سلامت (بہادر شاہ ظفر) کی ہستی ہے۔

11. میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش غالبؔ اس کا مگر نہیں ہے غلام

12. جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو تب کہا ہے بطرز استفہام

میں نے مانا کہ تو اُس ہستی کا حلقہ بگوش (غلام) ہے تو کیا میں (غالب) اس ہستی کا غلام نہیں ہوں؟ مجھے علم ہے کہ تو یہ بات جانتا ہے اسی لیے میں نے استفہام (سوال) کے انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے۔

13. مہر تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ قرب ہر روز بر سبیل دوام

14. تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا جزبہ تقریبِ عید ماہِ صیام

اے چاند! چونکہ آفتاب ہمیشہ ہر روز نکلتا ہے اس لیے اسے شاہی دربار میں باریاب ہونے کی عزت اگر ملے تو مل سکتی ہے لیکن تیرا یہ رتبہ کہاں کہ روز دربار میں حاضر ہو اور بادشاہ کا قرب حاصل کرے۔ہاں سال میں ایک مرتبہ عید کے موقع پر تجھے روشناسی کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ وہ ہم (شاعر) ہیں جو بادشاہ سلامت کے روشناس اور روزانہ دربار شاہی میں باریابی کے شرف سے مشرف ہیں۔

15. جانتاہوں کہ اس کے فیض سے تو پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام

16. ماہ بن، ماہتاب بن، مَیں کون مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام

17. میرا اپنا جدا معاملہ ہے اور کے لین دین سے کیا کام

میں خوب جانتاہوں کہ آج تو سلام کے لیے حاضر جو ہوا ہے تو تیرا مقصد کیا ہے؟ تو بادشاہ سلامت کے فیض کی بدولت ہلال سے بدر کامل بننا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے، تو ماہ بن، ماہتاب بن اس سے مجھے کیا غرض۔ میں کون جو اس معاملے میں دلچسپی لوں ۔ کیا تو اپنے انعام میں مجھے حصے دار بنائے گا۔ یقیناً نہیں۔ ویسے بھی تیرے انعام سے مجھے کوئی مطلب نہیں کیوں کہ میرا معاملہ بالکل الگ ہے۔ دوسروں کے لین دین سے مجھے کوئی غرض نہیں۔

18. ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص گر تجھے ہے امید رحمت عام

19. جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ کیا نہ دے گا مجھے مئے گل فام

اے مہ نو! میں بادشاہ سلامت کا خاص غلام ہوں اس لیے مجھے خاص بخشش کی آرزو ہے جب کہ تو بادشاہ کی رحمتِ عام کا امیدوار ہے کیونکہ تو ایک عام بندہ ہے جو بادشاہ تیری روشنی و تابانی کو بڑھوتری دے گا کیا وہ مجھے خاص بخشش یعنی پھول جیسی سرخ شراب نہ دے گا تا کہ میں چاندنی میں بیٹھ کر پینے کا لطف لوں۔ اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ اگر مجھے چاندنی رات میں پینے کو شراب نہ ملے تو چاند کو چاندنی عطا کرنے کا کیا فائدہ!

20. جب کہ چودہ منازل فلکی کر چکے قطع تیری تیزی گام

21. تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر کوے و مشکوے و صحن و منظروبام

22. دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام

اے مہ نو! جب تیری تیزرفتاری آسمان کی چودہ منزلوں کو طے کر چکے گی یعنی جب تو چودھویں رات کا چاند بن جائے گا تو تیری چاندنی سے کوچہ و محلات صحن و دیوار اور سارے مناظر روشن ہو کر جگمگانے لگیں گے اس وقت دیکھنا کہ میرے ہاتھ میں بھی تیری صورت کا (یعنی چمکتا ہوا) شراب سے لبریز ایک بلوریں جام ہو گا۔

23. کہہ چکا میں تو سب کچھ، اب تو کہہ اے پری چہرہ پیک تیزخرام

24. کون ہے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا ہیں مہ و مہرو زہرہ و بہرام

اے مہ نو! اے پری جیسے حسین اور خوب صورت تیزرفتار قاصد! (قاصد، پیام لانے والا، چونکہ مہ نو عید کا پیام لے کر آیا ہے اس لیے اسے قاصد کہا گیا ہے) میں تو اپنے دل کی ساری باتیں کہہ چکا۔ اب تیری باری ہے۔ تو بتا کہ وہ کون ہے؟ جس کے در پر چاند، سورج، زہرہ اور مریخ سب اپنی پیشانی گھستے ہیں یعنی سجدہ کرتے ہیں۔ اس سوال میں یہ جواب پوشیدہ ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی ذات ہے۔

23. تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن نامِ شاہنشہِ بلند مقام

24. قبلہ چشم و دل بہادرشاہ مظہر ذوالجلال و الاکرام

اے مہ نو! اگر تو اس ہستی کا نام نہیں جانتا تو مجھ سے سن کہ اس اونچے مرتبے کے حامل شہنشاہ کا نام میں بتاتا ہوں۔ اس کا نام مبارک، بہادر شاہ (ظفر) ہے جو ہر ایک آنکھ اور ہر ایک دل کا قبلہ اور خدائے ذوالجلال والاکرام (بزرگی اور اعزاز رکھنے والا) کے جلال اور اکرام کا مظہر ہے۔

27. شہسوار طریقہ انصاف نوبہارِ حدیقہ اسلام

بادشاہ سلامت! عدل و انصاف کے میدان کے شہسوار اور اسلام (جو سب سے انصاف کا حکم دیتا ہے) کے باغ کی نئی بہار ہیں۔

28. جس کاہر فعل صورت اعجاز — جس کاہر قول معنی الہام

بادشاہ کا ہر کام معجزہ کی طرح حیرت انگیز اوران کی ہر بات الہامی یعنی غیب سے اتری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

29. بزم میں میزبان قیصروجم — رزم میں اوستادِ رستم وسام

بادشاہ کی شان وشوکت ایسی ہے کہ قیصر اور جمشید جیسے بڑے بڑے بادشاہ بھی اس کے مہمان بننے پر فخر کرتے ہیں۔ سپہ گری کے فن میں وہ ایسے کامل ہیں کہ رستم اور سام جیسے سب سے طاقتور پہلوان، ان کو اپنا استاد مانتے ہیں۔

30. جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایام

31. اوران اوراق میں بہ کلک قضا — مجملاً مندرج ہوئے احکام

اس دنیا اور کائنات کی پیدائش سے قبل یعنی ازل کے دن لیالی(راتوں) اورایّام(دنوں) کے صفحات پر قضاوقدر کے کارکنوں نے تقدیر کے قلم سے مختصر طور پر اللہ تعالیٰ کے احکام درج کیے۔ یعنی جب ہر چیز کی تقدیر لکھی کہ کس دن کیا ہوگا؟ اور کس رات کیا ہوگا؟

32. تیری توقیع سلطنت کو بھی — دی بدستور صورت ارقام

33. کاتبِ حکم نے بموجب حکم — اس رقم کو دیا طرازِ دوام

34. ہے ازل سے روائی آغاز — ہو ابد تک رسائی انجام

تواس وقت یعنی ازل میں جب فرشتے اللہ کے احکام کی کتابت کر رہے تھے تو انہوں نے اللہ کے حکم سے ان صفحات پر بادشاہ سلامت کی حکمرانی کے بارے میں یہ لکھا کہ اس کی ابتدا ازل سے ہو اس کی سلطنت ابد تک قائم رہے۔ یعنی یہ ایک طرح سے دعا ہے کہ بادشاہ کی سلطنت سدا قائم رہے، اس کو کبھی زوال نہ ہو۔

4.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- قصیدہ اردو شاعری کی ایک اہم صنف ہے، جس میں کسی کی مدح(تعریف) یا ہجو(مذمت) کی جاتی ہے۔
- قصیدے میں غزل کی طرح ایک مطلع ہوتا ہے۔ باقی اشعار کے دوسرے مصرعوں میں قافیہ لایا جاتا ہے۔
- قصیدے کے چار اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں: 1۔ تشبیب(تمہید)، 2۔ گریز، 3۔ مدح، 4۔ دعا / مدعا۔
- قصیدے میں کم سے کم پندرہ اور زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو اشعار ہوتے ہیں۔

- تخیل کی بلندی، الفاظ کا شکوہ، بلند آہنگی، زور بیان، مضامین اور تشبیہات و استعارات کی ندرت قصیدے کے لوازمات میں سے ہیں۔
- غالب کا شمار اردو کے اہم قصیدہ گو شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ 1797 میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔
- غالب کے والد عبد اللہ بیگ خاں ایک لڑائی میں مارے گئے تو ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ خاں نے غالب کی سرپرستی کی۔ چچا کے انتقال کے بعد انگریز سرکار نے ان کی پنشن مقرر کی۔
- غالب کی زندگی کا بڑا حصہ تنگدستی اور معاشی پریشانیوں میں گزرا۔ عمر کے آخری حصے میں وہ کئی بیماریوں کا شکار ہو گئے تھے۔ 15 / فروری 1869 کو دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔
- غالب کی اردو تصانیف میں دیوانِ شاعری اور خطوط کے دو مجموعے (1) عودِ ہندی، (2) اردوئے معلیٰ اہم ہیں۔
- غالب نے غزل کے علاوہ قصائد بھی لکھے۔ ان کے اردو دیوان میں چار قصائد ملتے ہیں، جن میں دو حضرت علیؓ کی منقبت میں اور دو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔
- غالب نے اپنے قصائد میں اس صنف کے اجزائے ترکیبی اور لوازمات کا خاص خیال رکھا ہے۔
- غالب کے قصائد کی تشبیب میں ندرت، گریز میں برجستگی، مدح میں ممدوح کے مرتبے کے مطابق مضامین، شکوہ زبان اور مبالغہ اور مدعا / دعا میں اختصار اور جامعیت پائی جاتی ہے۔
- قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" بہادر شاہ ظفر کی مدح میں لکھا گیا ہے۔
- اس قصیدے کی تشبیب نہایت دلچسپ اور خوب صورت ہے، جس میں مہ نو سے مکالمہ کیا گیا ہے۔
- اردو قصائد کی تاریخ میں اس قصیدے کو اس کی تشبیب کی جدت کی بدولت امتیازی مقام حاصل ہے۔
- اس قصیدے کی گریز میں فطری انداز پایا جاتا ہے اور مدح کے مضامین بھی زبان اور بیان کے اعتبار سے بادشاہ کے شایانِ شان ہیں۔
- اس قصیدے کا اختتام دعائیہ شعر پر ہوتا ہے، جس میں ایک طرح سے یہ دعا ہے کہ بادشاہ کی سلطنت سدا قائم رہے۔ اس کو کبھی زوال نہ ہو۔

4.4 مشکل الفاظ

مہ	ماہ کا مخفف، چاند	Month; Moon (abbreviated)
مہ نو	نیا چاند، پہلی تاریخ	New moon
دمِ صبح	صبح کے وقت	Early morning
اندام	جسم	Body, physique
گردش	چکر	Rotation, Cycle, Movement
ایام	یوم کی جمع، دن	Days

دام	جال	Trap, net
حبّذا/مرحبا	تحسین کے کلمات، مبارک، خوش آمدید	Praise, welcome, felicitations
نمام	چغلی کرنے والا	Tattler, Gossip
امید گاہ	امیدیں پوری ہونے کی جگہ	Place where hopes are fulfilled
انام	عام لوگ	Common people
حلقہ بگوش	غلام	Slave
استفہام	سوال کرنا	Questioning, asking
مہر	سورج	Sun
تاباں	روشن، منور	Bright, shining
سبیل	راستہ	Path, way
دوام	ہمیشہ	Permanence, Continuity
روشناسی	حاضری، باریابی	Presence, Arrival, Attainment
فر	زیادتی، کثرت	Abundance, Excess
مئے	شراب	Wine
گلفام	پھول کے رنگ کی	Flower-colored
تیزی گام	تیز رفتاری	Fast-paced, quick movement
پرتو	سایہ	Shadow, reflection
زہرہ	ایک سیارے کا نام	Venus (planet)
بہرام	مریخ، ایک سیارہ	Mars (planet)
قبلہ چشم ودل	آنکھ اور دل کا مرکز	Center of eye and heart
مظہر	ظاہر کرنے والا	Manifestation, That which shows
حدیقہ	باغ	Garden
اعجاز	معجزہ	Miracle
الہام	غیب سے کسی بات کا دل میں آنا	Divine inspiration
قیصر	روم کے بادشاہوں کا لقب	Title of Roman emperors
جم	جمشید، ایران کا ایک بادشاہ	Jamshid, an Iranian king
رزم	جنگ	War, battle

رستم، سام	ایران کے مشہور پہلوانوں کے نام	Famous Iranian heroes
ازل	جس کی کوئی ابتدا نہ ہو	That which existed before creation
رقم پذیر ہونا	لکھا جانا	To be written down
کلک	قلم	Pen
قضا	تقدیر	Fate, divine will
مجملاً	سرسری	Briefly, Summarily
توقیع	شاہی فرمان تحریر کر کے مہر ثبت کرنا	Royal decree, signed and sealed
ارقام	تحریر	Writings, Inscriptions
طراز	نقش، نشان، زینت و آرائش	Design, Pattern, Ornamentation
دوام	ہمیشگی	Eternity, Perpetuity
ابد	جس کی کوئی انتہا نہ ہو	Eternity, That which has no end

4.5 مشقیں

مشق 1: اس قصیدے کا مطلع لکھیے اور اس کے قافیوں کو خط کشیدہ (Under Line) کیجیے۔

1۔ .... 2۔ ....

مشق 2: اس قصیدے کا دعائیہ شعر لکھیے۔

....

مشق 3: اس قصیدے میں نام، سلام، پیغام ہم قافیہ الفاظ ہیں۔ "جہاں" کے ہم قافیہ تین الفاظ لکھیے۔

1۔.................. 2۔.................... 3۔..................

مشق 4: اس قصیدے میں لفظ "مہر" آیا ہے، جس کے ایک معنی ہیں "سورج" اور دوسرے معنی ہیں "محبت"۔ اس قصیدے میں ایسے تین الفاظ تلاش کیجیے، جن کے دو معنیٰ ہوں۔

1۔.................. 2۔.................... 3۔..................

مشق 5: بدر (پورے چاند) کو تصور میں لائیے اور اس سے دو سوال کیجیے۔

1۔ ....

2۔ ....

مشق 6: کسی تاریخی عمارت، کسی شہر یا کسی شخصیت کی تعریف میں پانچ جملے لکھیے۔

1۔ ....

2۔ ....

3۔ ....

4۔ ....

5۔ ....

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی سوالات:

1۔ قصیدے میں کم سے کم کتنے اشعار ہوتے ہیں؟

(a)دس (b)بارہ (c)پندرہ (d)اٹھارہ

2۔ قصیدے میں تشبیب کے بعد کون سا حصہ آتا ہے؟

(a)مدح (b)گریز (c)دعا (d)مدعا

3۔ غالب کب پیدا ہوئے۔

(a)1750 (b)1775 (c)1780 (d)1797

4۔ غالب کے والد کا نام کیا تھا؟

(a)نصر اللہ بیگ خاں (b)فوقان بیگ (c)عبد اللہ بیگ خاں (d)مرزا اسد اللہ خاں

5۔ غالب نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی؟

(a)آگرہ (b)دہلی (c)لکھنؤ (d)کلکتہ

6۔ قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" کس کی مدح میں ہے؟

(a)محمد شاہ رنگیلے (b)شاہ عالم ثانی (c)اکبر شاہ ثانی (d)بہادر شاہ ظفر

7۔ بادشاہ نے غالب کو جو خطاب عطا کیے ان میں کون سا خطاب شامل نہیں تھا؟

(a)نجم الدولہ (b)اعتماد الملک (c)دبیر الملک (d)نظام جنگ

8۔ اس قصیدے کی تشبیب میں شاعر کس سے گفتگو کر رہا ہے؟

(a)آفتاب سے (b)آسمان سے (c)بادشاہ سے (d)ہلال عید سے

9۔ اس قصیدے میں دعا کے کتنے اشعار ہیں؟

(a)ایک (b)دو (c)تین (d)چار

10۔ رستم اور سام کس کے نام ہیں؟

(a)شاعروں کے (b)ستاروں کے (c)پہلوانوں کے (d)شہروں کے

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سولات:

1۔ قصیدے میں گریز کیا کام کرتی ہے؟ لکھیے۔

2۔ قصیدے کے آخری جزو دعا / مدعا میں کیا ہوتا ہے؟ بیان کیجیے۔

3۔ غالب نے اس قصیدے میں بادشاہ کے کن ہتھیاروں اور کن سواریوں کا ذکر کیا ہے؟ لکھیے۔

4۔ غالب کی ابتدائی تعلیم پر نوٹ لکھیے۔

5۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

تیری توقیع سلطنت کو بھی　　دی بدستور صورت ارقام
کاتبِ حکم نے بموجب حکم　　اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائی آغاز　　ہو ابد تک رسائی انجام

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سولات:

1۔ قصیدے کے اجزائے ترکیبی بیان کیجیے۔

2۔ غالب کے حالات زندگی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ لکھیے

3۔ قصیدہ "ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام" کی خوبیوں پر اظہار خیال کیجیے۔

4.6.1 کے

جوابات:

(i) C	(ii) B	(iii) D	(iv) C	(v) A
(vi) D	(vii) B	(viii) D	(ix) A	(x) C

بلاک II

اکائی 5: مرثیہ

"دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر" (انیسؔ)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 مرثیہ "دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر" (انیسؔ)
5.2.1 مرثیہ
5.2.2 میر انیس کا تعارف
5.2.3 مرثیہ کے منتخب بند
5.2.4 منتخب بند کی تشریح
5.3 اکتسابی نتائج
5.4 مشکل الفاظ
5.5 مشقیں
5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.0 تمہید

اس اکائی میں ہم نے اردو کے ایک نامور اور نہایت مشہور مرثیہ نگار شاعر میر ببر علی انیس کا تعارف کروایا ہے۔ اور ان کے ایک مرثیہ "دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر" کے منتخب بند کو پیش کرتے ہوئے ان کی تشریح بھی کی ہے اور انیس کے اس مرثیہ کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس کی فنی خوبیوں کا تذکرہ بھی کیا ہے اور مشکل الفاظ کو معانی کے ساتھ درج بھی کیا گیا ہے۔

5.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اردو کے نامور مرثیہ نگار شاعر، انیس کا تعارف پیش کر سکیں۔
- مرثیے کے منتخب بند کو صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھ سکیں۔

- اس اکائی میں پیش کیے گئے مرثیہ ''دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر '' کی تشریح کر سکیں۔
- مرثیہ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھ سکیں۔

5.2 مرثیہ ''دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر''(انیسؔ)

5.2.1 مرثیہ:

مرثیہ شاعری کی اُس صنف کو کہاجاتا ہے جس میں کسی کی وفات پر اظہار غم، اور مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جائیں۔ یہ اردو کی مقبول صنف سخن ہے۔ اس صنف میں ابتدا ہی سے توجہ کی گئی۔ قدیم اردو یا دکنی کے کم و بیش تمام شاعروں نے مرثیے لکھے۔

زمانہ قدیم میں دوبیتی، مربع، مثلث اور مخمس کے فارم میں بھی مرثیے رائج رہے۔ مسدس مرثیے کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ سودا نے مرثیہ کو مسدس کی شکل میں روشناس کیا۔ انیس اور دبیر کے مرثیوں کی مقبولیت کی وجہ سے مسدس کے فارم کو مرثیہ سے مخصوص سمجھا جانے لگا۔

مرثیے واقعات کربلا پر مبنی ہوتے ہیں اس میں امام حسینؑ کے جاں نثار اور خانوادۂ امام حسینؑ کی سیرت، شخصیت، کردار، جذبات، احساسات، اعزا سے رخصتی، میدان کارزار میں فدائیان حسینؑ کی آمد، آلات حرب وضرب، جنگ کا منظر، گھوڑوں کی تیزی، تلواروں و نیزوں کی چمک دمک، فرات کے کنارے پر دشمن کی فوج کے پہرے، پیاسوں کی شہادت اور پھر ان کے زخمی لاشوں پر بین وبکا وغیرہ۔ یہ تمام واقعات کے اظہار کے لیے مرثیہ کے اجزائے ترکیبی مقرر کیے گئے ہیں جو آٹھ ہیں۔(۱) چہرہ۔(۲) سراپا۔(۳) رخصت۔ (۴) آمد۔(۵) رجز۔(۶) رزم۔(۷) شہادت۔(۸) بین۔

اردو میں غیر مذہبی، شخصی، اور قومی مرثیوں کی بھی کمی نہیں۔ جہاں تک شخصی مرثیوں کا تعلق ہے غزل کے فارم کو شخصی مرثیوں کے لیے مخصوص کیا گیا۔ اس سلسلہ میں حالی، اقبال، سرور جہاں آبادی، چکبست اور صفی لکھنوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان شعراء نے مختلف علمی اور ادبی یا سیاسی شخصیتوں کی وفات پر مرثیے لکھے ہیں۔ اردو میں مرثیہ کا فن سب سے زیادہ پھولا پھلا اور عزاداری کے رواج نے تمام دنیا کے سامنے پیش کیا۔ انیس و دبیر جیسے شعراء نے مرثیے کو جس بلندی پر پہنچایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرثیے آج بھی صنف ادب میں خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

واقعہ کربلا سے متعلق چند اہم کردار:

واقعہ کربلا سے متعلق مرثیوں کے چند اہم کردار وں کو پیش کیا جارہا ہے۔ جن کے بارے میں آپ کو جاننا ضروری ہے۔ کیونکہ مرثیے ان ہی کرداروں کے اطراف گھومتے ہیں۔

1۔ حضرت امام حسینؑ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ کے نواسے یعنی حضرت علیؑ و حضرت فاطمہؑ کے دوسرے فرزند اور حضرت امام حسنؑ کے چھوٹے بھائی اور واقعہ کربلا کی مرکزی شخصیت۔

2۔ حیدر کردار: حضرت علیؑ کا لقب

3۔ حضرت فاطمہ زہراؑ: حضرت محمد مصطفیؐ کی صاحبزادی، حضرت علیؑ کی زوجہ اور حضرت امام حسینؑ کی والدہ محترمہ۔

4۔ حضرت زینبؓ: حضرت امام حسینؑ کی چھوٹی بہن، جنھوں نے معرکۂ کربلا میں بڑے تدبر اور دلیری سے اہل بیتؑ حسینؑ کی نگہبانی اور رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔

5۔ حضرت عباسؓ: حضرت امام حسینؑ کے چھوٹے بھائی جو حضرت علیؑ کی دوسری زوجہ حضرت ام البنین کے بطن سے تھے۔

6۔ حضرت بانو: حضرت امام حسینؑ کی بیوی جو شاہ ایران کی پوتی تھیں۔

7۔ حضرت علی اکبرؓ: حضرت امام حسینؑ کے منجھلے فرزند جنھوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں واقعہ کربلا میں شہادت پائی۔

8۔ حضرت سید سجادؓ یا عابد بیمار: حضرت امام حسینؑ کے بڑے فرزند۔

9۔ حضرت علی اصغرؓ: حضرت حسینؑ کے چھ ماہ کے فرزند جو شہید ہوئے۔

5.2.2 مرثیہ نگار کا تعارف:

میر ببر علی نام اور تخلص انیس تھا۔ 1803ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ انیس کے پردادا میر ضاحک اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔ ان میں اور سودا میں بڑے دل چسپ معرکے ہوا کرتے تھے۔ میر ضاحک کے فرزند میر حسن اردو کے نہایت بلند پایہ شاعر تھے جن کی مثنوی ''سحر البیان'' اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔ میر حسن کے تین بیٹے تھے۔ خلق، خلیق اور مخلوق۔ انیس، خلیق کے فرزند تھے۔ انیس کے دو بھائی انس اور مونس بھی مرثیہ گو شاعر تھے۔ لیکن عظمت اور مقبولیت انیس کو ملی۔

انیس نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ انیس کی والدہ بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ انیس نے علمی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور خداداد ذہانت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ انھوں نے اپنی زندگی صنفِ مرثیہ کے فروغ کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کی وفات 1874ء میں ہوئی۔

انیس، اردو کے سب سے بڑے مرثیہ گو شاعر ہیں۔ انھوں نے واقعات کربلا کے مختلف پہلوؤں پر طویل مرثیے بھی لکھے ہیں۔ انسانی فطرت کی ماہرانہ عکاسی، جذبات واحساسات کی تصویر کشی، میدان جنگ، صبح، دوپہر اور شام کی کیفیات کی منظر کشی، انیس کے مرثیوں میں بہت عام ہے۔ کربلا کے جس پہلو پر بھی وہ قلم اٹھاتے ہیں، اپنی شاعرانہ فن کاری، قدرت زبان اور موثر اسلوب کے ذریعہ ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔ کوئی فرد انیس کے مرثیوں کو پڑھ کر دل پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشعار شاعر کے دل سے نکل رہے ہیں اور پڑھنے والوں کے دل میں اترتے جاتے ہیں۔

5.2.3 ''دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر'' کے منتخب بند:

دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر راحت کوئی آرام جگر سے نہیں بہتر
لذت کوئی، پاکیزہ ثمر سے نہیں بہتر نکہت کوئی بوئے گل تر سے نہیں بہتر
صدموں میں علاج دل مجروح یہی ہے
ریحاں ہے یہی، راح یہی، روح یہی ہے
یہ وہ ہے عصا، پیر جواں رہتا ہے جس سے یہ وہ ہے نگیں، نام ونشاں رہتا ہے جس سے

وہ شمع ہے پر نور مکاں رہتا ہے جس سے　　　وہ در ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال، زر و مال کے بدلے

موتی بھی لٹا دیتے ہیں، اس لعل کے بدلے

اب رخصت اکبر ہے شہ تشنہ دہاں سے　　　فرزند بچھڑتا ہے امام دو جہاں سے

پیری میں چھڑاتا ہے فلک، تازہ جواں سے　　　کس فصل میں درپیش ہے فرقت تن و جاں سے

آتی ہے اجل، گود کا پالا نہیں جاتا

صابر سے کلیجے کو سنبھالا نہیں جاتا

فرماتے ہیں فرزند سے آنکھوں کو چرا کر　　　دیکھ آؤ ذرا، مادر ناشاد کو جا کر

کہتا ہے وہ ناشاد جواں اشک بہا کر　　　اب جائیں گے خیمے میں سناں سینے میں کھا کر

منھ نیزہ و شمشیر سے موڑا نہیں جاتا

سب چھوٹیں مگر آپ کو چھوڑا نہیں جاتا

مولا یہ غلام اب متمنی ہے رضا کا　　　مشتاق ہے یہ خشک گلا آب بقا کا

شہرہ ہے علمدارِ دلاور کی وِغا کا　　　کچھ کام تو خادم سے بھی ہو راہِ خدا کا

اس خاک کا ذرہ ہو جو خورشید وہی ہے

جو آج مرے زندہ جاوید وہی ہے

چھوٹے جو ہوں، وہ جو ہر شمشیر دکھائیں　　　ہم خاک بسر روتے ہوئے لاشوں پہ جائیں

عباس علی خوں میں لب نہر نہائیں　　　بعد ان کے بھی سر دینے کا ہم اذن نہ پائیں

فرزند فدا باپ، پہ ہوتے نہیں شاید

ہم حیدر کرار کے پوتے نہیں شاید

یہ کہہ کے جو قدموں پر گرا وہ مہ انور　　　سر چھاتی سے لپٹا کے یہ کہنے لگے سرور

میں مانع تحصیل سعادت نہیں دلبر　　　جو تم سے بن آئے وہ کرو اے علی اکبر

یہ سنتے ہی دنیا سے گذر جائے گی زینبؑ

رونا مجھے اس کا ہے کہ مر جائے گی زینبؑ

عمر اس نے گنوائی ہے محبت میں تمہاری　　سب ہیں یہ وہ عاشق ہے حقیقت میں تمہاری
اٹھارہ برس کاٹے ہیں الفت میں تمہاری　　کیونکر اسے صبر آئے گا، فرقت میں تمہاری
اللہ ہی چاہے تو نہ حائل کوئی شئے ہو
یہ مرحلہ ایسا ہے کہ دو باتوں میں طے ہو

یہ سن کے گیا خیمہ میں وہ صاحب توقیر　　الفت سے پھری گرد پسر، بانوئے دلگیر
لپٹا کے گلے کہنے لگی شاہ کی ہمشیر　　سنولا گئی ہے دھوپ میں یہ چاند سی تصویر
دو دن سے اس آفت میں نہیں سوئے ہو بیٹا
آنکھوں پہ ورم کیسا ہے کیا روئے ہو بیٹا

حضرت کی تو ہے خیر، کہو اے مرے دلبر　　اشک آنکھوں سے ٹپکا کے یہ بولا وہ دلاور
اب خیر کہاں کٹ گیا سب شاہ کا لشکر　　نہ آپ کے بیٹے نہ بھتیجا نہ برادر
عمو نے بھگایا تھا جنہیں وہ بھی پھرے ہیں
مظلوم پدر لاکھ سواروں میں گھرے ہیں

اک ہم ہیں کہ بابا کی مدد کر نہیں سکتے　　اظہار جو اس مردی جد کر نہیں سکتے
فوجوں کو ہٹا دینے میں کد کر نہیں سکتے　　بے حکم کوئی وار بھی رد کر نہیں سکتے
دربار میں سر دینے کی باری نہیں آتی
سب مرتے ہیں اور موت ہماری نہیں آتی

سر دے کے شجاعان عرب خلد میں پہنچے　　دنیا سے بصد عیش و طرب خلد میں پہنچے
پھر راحت و آرام ہے، جب خلد میں پہنچے　　اے وائے، ہمیں رہ گئے سب خلد میں پہنچے
آفت میں کوئی روکنے والا ہی نہ ہوتا
اے کاش پھوپھی نے ہمیں پالا ہی نہ ہوتا

زینبؑ نے کہا، کس پہ یہ غصہ ہے میں واری　　کچھ منھ سے کہا میں نے کہ مادر نے تمہاری
کیا وجہ، یہ کس بات پہ ہے گریہ وزاری　　سج لیجئے ہتھیار، طلب کیجئے سواری
انصاف کرو صدقے گئی اہل وفا ہو

روکیں تو پدر، پالنے والوں سے خفا ہو

عابد کی طرف دیکھ کر دوڑے علی اکبر　　آنکھوں کو ملا ہاتھوں سے قدموں پہ ملا سر
سجاد نے فرمایا کلیجے سے لگا کر　　گردن میں میری ڈال دو باہوں کو برادر
شانے کے قریں، زلف معنبر رہے بھائی
چہرہ مرے چہرے کے برابر رہے بھائی

اے روشنی خانۂ زہراؑ ترے صدقے　　اے باپ کے عاشق مرے شیدا ترے صدقے
اے تشنہ لب، بیکس و تنہا ترے صدقے　　اے رہ رو فردوسِ معلیٰ ترے صدقے
گھر آج اجڑتا ہے لٹے جاتے ہیں بھائی
ہم قافلے والوں سے چھٹے جاتے ہیں بھائی

5.2.4 منتخب بند کی تشریح:

اس مرثیہ میں انیس نے دو منظر پیش کیے ہیں۔ جب حضرت امام حسینؑ کے صاحبزادے علی اکبر، جو اٹھارہ سال کے نوجوان ہیں میدان جنگ میں جانے کے لیے اپنے والد حضرت حسینؑ اور خواتین محترم سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ اس موقع پر حضرت حسین اور خواتین کے دلوں کی جو حالت تھی، اس کی ترجمانی انیس نے بڑے مؤثر انداز میں کی ہے۔

پہلا بند: انیس کہتے ہیں کہ بیٹا یا اولاد، انسان کے لیے دنیا میں سب سے بڑی دولت ہے۔ زندگی میں فرزند ہی آرام، راحت اور خوشی کا سامان ہوتا ہے۔ اور نیک سیرت فرزند کی مثال ایک پاکیزہ ثمر کی سی ہے۔ جس کی لذت بے مثال ہوتی ہے۔ یا وہ ایک تازہ پھول کے مانند ہوتا ہے جس کی خوشبو سے زیادہ کوئی اور خوشبو عزیز نہیں ہوتی۔ دل غمگین ہو تو فرزند کے دم سے خوشی میسر ہوتی ہے۔ یہی ریحان، یہی راحت اور یہی روح بھی ہے۔

دوسرا بند: انیس کہتے ہیں کہ بیٹے کی مثال ایک عصا کی سی ہے۔ جو معمر والدین کے لیے ایک سہارے کا کام دیتا ہے۔ یا اس کی مثال مہرِ نگیں کی سی ہے جس کی بدولت انسان کا نام و نشان باقی رہتا ہے۔ فرزند ایک شمع ہے جس کی وجہ سے گھر پر نور رہتا ہے۔ یا اس کی مثال ایک موتی یا مروارید کی سی ہے جو طاقت حیات بخشا ہے۔ پسر یعنی بیٹا ایک ایسی دولت ہے جس کی خاطر، انسان موتی لٹانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ اس بند میں انیس نے اولاد کی اہمیت مختلف تشبیہوں کے ذریعہ بیان کی ہے اور بیٹے کو انسان کی سب سے بڑی دولت بتایا ہے۔

تیسرا بند: تمہید کے بعد انیس نے منظر کشی کی ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت حسینؑ نے اپنے عزیزوں کی شہادت کے غم سے، چور چور ہیں۔ پانی میسر نہیں اور وہ تشنہ دہن ہیں۔ ایسے عالم میں حضرت علی اکبرؑ اپنے والد سے میدان جنگ میں جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں۔ حضرت حسینؑ سے ان کا فرزند، بچھڑنے کو ہے۔ ظالم آسمان بڑھاپے میں نوجوان فرزند کو ان سے دور کر رہا

ہے۔ عین نوجوانی کے زمانے میں حضرت علی اکبرؑ کی جدائی غضب ڈھارہی ہے۔ اس وقت گود کا پالا بچہ رخصت نہیں ہو رہا ہے بلکہ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ موت آرہی ہے۔ حضرت حسینؑ صابر ہیں۔ لیکن اب یہ صابر بھی اپنے دل کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہے۔

چوتھا بند: انیس کہتے ہیں کہ فرزند کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنا ممکن نہیں ہے اس لیے حضرت حسینؑ نے آنکھیں چراتے ہوئے فرزند سے کہا، ذرا اپنی مغموم ماں کو دیکھ آؤ۔ علی اکبرؑ جو پہلے ہی سے مغموم ہیں کہ انہیں اب تک میدان جنگ میں جانے کا موقع نہیں دیا گیا ہے۔ آنسو بہا کر کہتے ہیں کہ اب میں تیر و خنجر سے زخمی ہونے کے بعد ہی خیمے میں جاؤں گا اور کہتے ہیں کہ اب میں نیزہ و شمشیر سے مقابلہ کے لیے بے چین ہوں۔ سب چھوٹ جائیں لیکن آپ سے جدائی ممکن نہیں۔

پانچواں بند: علی اکبرؑ اپنے والد سے درخواست کرتے ہیں کہ اے میرے آقا، آپ کا غلام اجازت کا متمنی ہے۔ میرا خشک گلا آب بقا کا منتظر ہے جو شہادت کے بعد میسر ہو سکتا ہے۔ ہماری فوج کے بہادر علمدار، (یعنی حضرت عباسؑ) کی دلیرانہ جنگ کا ہر طرف چرچا ہے۔ مجھے بھی موقع دیجئے کہ یہ خادم بھی خدا کی راہ میں کچھ کر دکھائے۔ آپ کے قدموں کی خاک کا ہر ذرہ آفتاب کا مرتبہ رکھتا ہے۔ میں آج آپ کے قدموں میں نچھاور ہو جاؤں گا تو زندہ جاوید ہو جاؤں گا۔

چھٹا بند: اس بند میں انیس نے وہ منظر دکھایا ہے جس میں حضرت علی اکبرؑ اپنے والد محترم سے شکوہ کرتے ہیں کہ جو مجھ سے چھوٹے تھے۔ انہوں نے بھی تلوار کے جوہر بتائے، ہم صرف روتے ہوئے لاشوں پر جارہے ہیں۔ حضرت عباسؑ دریائے فرات کے کنارے خون میں نہاگئے۔ ان کے بعد بھی ہم کو سر کٹانے کی اجازت نہیں ملتی۔ شاید آپ خیال فرماتے ہیں کہ فرزند، باپ پر فدا نہیں ہوا کرتا۔ کیا میں حیدر کرار کا پوتا نہیں ہوں۔

ساتواں بند: یہ کہتے ہوئے وہ خوبصورت نوجوان (علی اکبر) اپنے والد کے قدموں میں گر پڑتے ہیں۔ حضرت حسینؑ نے ان کا سر سینے سے لگایا اور کہا۔ اے عزیز! میں اس نیک بختی کے حاصل کرنے میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ جو تم سے بن آئے کر گذرو لیکن زینبؑ یہ خبر سنے گی تو جان ہی دے دے گی۔ رونا اسی کا ہے کہ وہ تمہاری جدائی بالکل برداشت نہیں کر سکے گی۔

آٹھواں بند: حضرت حسینؑ کہتے ہیں کہ زینبؑ نے تمہاری محبت میں عمر گنوائی ہے۔ سب تو تمہیں چاہتے ہیں لیکن وہ تمہاری عاشق ہے۔ تمہاری محبت میں انہوں نے اٹھارہ برس کاٹے ہیں۔ اب تمہاری فرقت میں انہیں کیسے صبر آئے گا۔ خدا کی مرضی یہی ہے تو کوئی شئے حائل نہیں ہو سکتی۔ شاید یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے گا۔

نواں بند: حضرت حسینؑ سے یہ بات سننے کے بعد علی اکبرؑ خیمہ میں داخل ہوئے۔ مغموم والدہ جناب بانو نے محبت سے ان کے گرد ایک چکر لگایا اور حضرت حسینؑ کی ہمشیرہ حضرت زینبؑ نے علی اکبر کو گلے لگایا اور کہنے لگی کہ تمہاری چاند جیسی صورت دھوپ سے سنولا گئی ہے دو دن سے تمہیں نیند نہیں ملی۔ تمہاری آنکھوں پر ورم معلوم ہوتا ہے، کیا تم روئے ہو؟

دسواں بند: اور حضرت زینبؑ نے پوچھا، بتاؤ حضرت حسینؑ عافیت سے ہیں۔ علی اکبرؑ نے آنسو بہا کر کہا، کیا بتاؤں سارے لشکر کا خاتمہ ہو چکا ہے آپ کے بیٹے باقی رہے نہ بھتیجے، نہ بھائی۔ چچا۔ (حضرت عباسؑ) نے جن دشمنوں کو بھگا دیا تھا وہ پھر لوٹ کر آگئے ہیں اور اب والد بزرگوار ہیں اور ان کے مقابل میں ہزاروں سوار۔

گیارہواں بند: حضرت علی اکبرؑ کہنے لگے کہ میدان جنگ میں اب تک ہم نے بابا کی خاطر کچھ نہیں کیا۔ آباؤ اجداد کی شجاعت کا کوئی جوہر نہیں دکھایا۔ دشمن کی فوج کو پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش نہیں کی۔ کیوں کہ والدہ کے حکم کے بغیر ہم دشمن کا وار بھی رد نہیں کرسکتے۔ دربار حسینؑ میں اپنا سر پیش کرنے کی باری ابھی تک نہیں آئی، سب نے شہادت پائی لیکن ہمیں موت نہیں آئی۔

بارہواں بند: ہماری فوج کے بہادروں نے شہادت پائی اور جنت میں پہنچ گئے۔ وہ بڑی خوشی اور مسرت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوئے اور جنت میں ہیں اور جب ایک بار جنت میں داخل ہو جائیں تو پھر آرام ہی آرام ہے۔ کیا خوب، سب جنت میں جا پہنچے ہیں اور ہم باقی رہ گئے۔ کاش! اس مصیبت میں کوئی ہمیں روکنے والا نہیں ہوتا اور کاش پھوپھی (حضرت زینبؑ) نے ہمیں پال پوس کر بڑا نہ کیا ہوتا۔

تیرہواں بند: یہ شکایت سن کر حضرت زینبؑ نے کہا۔ میں تمہارے صدقے، کیا تم مجھ پر غصہ کر رہے ہو، کیا میں نے یا تمہاری ماں نے کچھ کہا ہے؟ کیوں خفا ہو اور کیوں گریہ وزاری کر رہے ہو۔ شوق سے میدان کو سدھارو، ہتھیار سجاؤ اور سواری منگواؤ۔ میں تمہارے صدقے۔ تم ہی انصاف کرو، تم سچے وفادار ہو، والد تمہیں روک رہے ہیں اور تم ہم سے ناراض ہوتے ہو۔ جب حضرت زینبؑ نے اس طرح اجازت دی تو خیمے میں سب رونے لگے، شہیدوں کی خواتین میں آہ وزاری کا غل تھا۔ یہ قیامت کا سا منظر تھا۔ آہ وزاری کے اس شور میں علی اکبرؑ رخصت ہوئے۔ حضرت حسینؑ کے بڑے صاحب زادے حضرت سجادؑ (زین العابدین) جو بیمار ہونے کے سبب صاحبِ فراش تھے اور اس وقت غش کی حالت ان پر طاری تھی، شور و غل کی آواز سن کر اچانک بیدار ہو گئے۔ انہیں خیال ہوا کہ شاید پیاس کے سبب علی اصغر چل بسے ہیں۔

چودھواں بند: علی اکبر نے اپنے بھائی عابد کو دیکھا تو ان کی طرف دوڑے۔ ان کے ہاتھ، اپنی آنکھوں سے ملے اور قدموں پر سر رکھا۔ حضرت سجاد (زین العابدین) نے انہیں سینے سے لگایا اور علی اکبر سے خواہش کی کہ تم بھی میری گردن میں اپنی بانہیں ڈال دو اور اپنی زلفیں میرے کندھے پر پھیلا دو، چہرہ میرے چہرے سے لگا دو۔

پندرہواں بند: اور حضرت سجاد (زین العابدین) نے فرمایا۔ اے فاطمہ کے گھر کی روشنی! میں تیرے نثار، اے باپ کے عاشق اور میرے شیدا میں تیرے نثار۔ اے تشنہ لب اور بے کس، میں تیرے صدقے، اے فردوس کو روانہ ہونے والے میں تیرے قربان، بھائی! تم آج جا رہے ہو، گھر اجڑ رہا ہے تم ہم قافلہ والوں کو چھوڑ کر رخصت ہو رہے ہو۔

5.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- انیس اردو کے ایک نہایت مشہور مرثیہ نگار ہیں۔ جنہوں نے ساری زندگی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے لیے وقف کر دی تھی۔ انیس کو مرثیہ نگاری میں کمال حاصل تھا اور انہوں نے صنف مرثیہ کو عروج کمال تک پہنچایا۔
- اس مرثیہ "دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر" میں انیس نے حضرت علی اکبر کی رخصت کا حال بیان کیا ہے۔
- مرثیہ کی ابتدا میں انیس نے مختلف پیرایوں اور مثالوں کے ذریعہ، فرزند کی اہمیت اجاگر کی ہے۔ اس کے بعد حضرت علی اکبرؑ کو اپنے والد سے اجازت کا طلب گار بتایا ہے۔

- اس مرثیہ میں مذکورہ دونوں کرداروں کے علاوہ حضرت حسینؑ کی بیوی حضرت بانو، حضرت حسین کی بہن حضرت زینبؑ، حضرت حسین کے بڑے صاحبزادے، حضرت سجاد (زین العابدین) کا بھی ذکر ہے۔ انیس نے نہایت خوبی کے ساتھ ہر ایک کردار کے مرتبہ اور لحاظ سے اس مرثیہ میں مکالمے ادا کروائے ہیں۔ اور حضرت علی اکبر کی رخصت طلبی پر ان کی والدہ اور پھوپھی پر جو کیفیت طاری ہوئی، انیس نے اس کو موقع و محل کے لحاظ سے بیان کیا ہے۔
- انیس نے اس مرثیے میں موقع و محل اور حفظ مراتب کے لحاظ سے بہت ہی موثر اور دردانگیز مکالمے ادا کرائے ہیں اور اقتضائے حال کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ فصاحت اور بلاغت کو بھی فن کاری کے ساتھ برتا ہے۔

5.4 مشکل الفاظ

آرام جگر	(مراد) باعث تسکین، باعث آرام، دل کا سکون	Source of comfort, soothing; peace of mind
نکہت	خوشبو	Fragrance, pleasant scent
راح	راحت، خوشبو	Comfort, fragrance
نگیں	نگینہ	Gemstone, Jewel
دُر	موتی	Pearl
امام دوجہاں	دونوں جہان کے امام، مراد امام حسینؑ	Imam of both worlds (referring to Imam Hussain □)
صابر	صبر کرنے والا	Patient person
آبِ بقا	زندگی کا پانی (وہ پانی جس کو نوش کرنے کے بعد انسان ہمیشہ زندہ رہتا ہے)، مراد شہادت پانا	Water of life (immortalizing water)
زندہ جاوید	ہمیشہ زندہ رہنے والا	Ever-living, Immortal
سَرور	مالک، آقا	Master, Lord
مانع	رکاوٹ ڈالنے والا، روکنے والا	Preventer
سعادت	نیک بختی	Good fortune, Blessedness
دل گیر	غمگین	Saddened, Sorrowful
کد	مشقت	Hardship, Labor
حزیں	رنجیدہ، مغموم	Grieved, Sorrowful
روشنی خانہ زہرا	جناب زہرا کے گھر کا چراغ، مراد بیٹا، اولاد	Lamp of Lady Zahra's house; metaphorically, child or offspring
مُصر	اصرار کرنے والا، کسی بات پر اڑ جانے والا	Insistent, Adamant
اقتضا	خواہش کرنا، چاہنا، ضرورت	Desire, Need, Necessity

Basil Plant, Fragrant Herb	ایک خوشبودار پودا، تلسی	ریحان
Staff, Stick	لاٹھی	عصا
Ruby, Red precious stone	یاقوت، سرخ رنگ کا قیمتی پتھر	لعل
Thirsty, Parched	پیاسا	تشنہ دہاں
Death	موت	اجل
Spear, Lance	نیزہ، برچھی	سناں
Standard-bearer (Referring to Hazrat Abbas □)	علم تھامنے والا، مراد حضرت عباسؑ	علم دار
Battle, Combat	جنگ	وغا
Full moon	ماہ کامل، چودہویں کا چاند	مہ انور
Permission, Consent	اجازت	اِذن
To obtain, Acquire	حاصل کرنا	تحصیل
Person of high status, Dignitary	بلند مرتبے والا	صاحب توقیر
Ancestor, Forefather	باپ دادا	جد
Paradise	جنت	خلد
Thirst	پیاس	عطش
Traveler, Wayfarer	راستہ چلنے والا	رہرو
Fighting, attack; war and strike	مار کاٹ، جنگ	حرب وضرب

5.5 مشقیں

مشق 1: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

i. زمانہ قدیم میں دوبیتی، مربع، مثلث اور مخمس کے فارم میں بھی مرثیے لکھے گئے۔ ( )

ii. مسدس مرثیے کی انتہائی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ( )

iii. مرثیے کے اجزائے ترکیبی چھے ہیں۔ ( )

iv. غزل کے فارم کو شخصی مرثیے کے لیے مخصوص کیا گیا۔ ( )

v. حضرت عباسؑ امام حسینؑ کے بڑے بھائی تھے۔ ( )

vi. امام حسینؑ حضرت علیؑ اور جناب فاطمہؑ کے بڑے فرزند تھے۔ ( )

5.6 نمونہ امتحانی سوالات

5.6.1 معروضی سوالات:

(1) وہ صنف جس میں مرنے والے کے اوصاف بیان کیے جاتے ہیں ؟

(a) مرثیہ (b) واسوخت (c) رباعی (d) غزل

(2) مرثیے کے اجزائے ترکیبی کتنے ہیں ؟

(a) چار (b) آٹھ (c) پانچ (d) دس

(3) حیدر کرار کس کا لقب تھا؟

(a) حضرت امام حسنؑ (b) حضرت امام حسینؑ (c) حضرت علیؑ (d) حضرت عباس

(4) میر انیس کہاں پیدا ہوئے ؟

(a) دہلی (b) فیض آباد (c) لکھنؤ (d) آگرہ

(5) انیس کا میر حسن سے کیا رشتہ تھا؟

(a) نانا، نواسہ (b) باپ، بیٹا (c) دادا، پوتا (d) بھائی بھائی

(6) نکہت کے کیا معنی ہیں ؟

(a) خوشبو (b) صحرا (c) چمن (d) بیابان

(7) حضرت علی اکبرؑ کی عمر کتنی تھی؟

(a) 11سال (b) 10سال (c) 18سال (d) 21سال

(8) انیس کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) خلق (b) خلیق (c) مخلوق (d) مونس

(9) "دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر" اس مرثیے میں کس کی شہادت کا بیان ہے ؟

(a) حضرت علی اکبرؑ (b) حضرت علی اصغرؑ (c) امام حسینؑ (d) حضرت عباس

(10) انیس کی وفات کب ہوئی؟

(a) 1800 (b) 1874 (c) 1870 (d) 1860

5.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. انیس کا مختصر تعارف کرائیے۔
2. امام حسینؑ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟ چند جملوں میں بیان کیجیے۔
3. حضرت علی اکبر نے میدان جنگ میں جانے کی اجازت کس طرح طلب کی؟

4. صنف مرثیے کے بارے میں لکھیے۔

5. مرثیے کے اس بند کی تشریح کیجیے۔

اک ہم ہیں کہ بابا کی مدد کر نہیں سکتے — اظہار جوانمردی جد کر نہیں سکتے

فوجوں کو ہٹا دینے میں کد کر نہیں سکتے — بے حکم کوئی وار بھی رد کر نہیں سکتے

دربار میں سر دینے کی باری نہیں آئی

سب مرتے ہیں موت ہماری نہیں آئی

5.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. انیس کے اس مرثیہ "دولت کوئی دنیا میں پسر سے نہیں بہتر" کا خلاصہ بیان کیجئے۔

2. واقعہ کربلا سے متعلق چند اہم کرداروں کا تعارف کروائیے۔

3. مرثیے کے ان بندوں کی تشریح کیجیے۔

یہ وہ ہے عصا، پیر جواں رہتا ہے جس سے — یہ وہ ہے نگیں، نام ونشاں رہتا ہے جس سے

وہ شمع ہے پرنور مکاں رہتا ہے جس سے — وہ در ہے قوی رشتۂ جاں رہتا ہے جس سے

کھوتے نہیں یہ مال، زر و مال کے بدلے

موتی بھی لٹا دیتے ہیں، اس لعل کے بدلے

اب رخصت اکبر ہے شہ تشنہ دہاں سے — فرزند بچھڑتا ہے امام دو جہاں سے

پیری میں چھڑاتا ہے فلک، تازہ جواں سے — کس فصل میں درپیش ہے فرقت تن و جاں سے

آتی ہے اجل، گود کا پالا نہیں جاتا

صابر سے کلیجے کو سنبھالا نہیں جاتا

5.6.1 کے جوابات:

A (i)	B (ii)	C (iii)	C (iv)	C (v)
A (vi)	C (vii)	B (viii)	A (ix)	B (x)

اکائی 6: مرثیہ

” بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے“ (دبیرؔ)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 مرثیہ ” بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے“ (دبیرؔ)

6.2.1 مرزا دبیر کا تعارف

6.2.2 مرثیے کے منتخب بند

6.2.3 منتخب بند کی تشریح

6.3 اکتسابی نتائج

6.4 مشکل الفاظ

6.5 مشقیں

6.6 نمونہ امتحانی سوالات

6.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں ہم نے انیس کے مرثیے کے منتخب بندوں کا مطالعہ کیا جو حضرت علی اکبرؑ کی شہادت کے بارے میں تھے۔ نصاب میں شامل اس مرثیہ میں امام حسینؑ کے چھ ماہ کے فرزند حضرت علی اصغرؑ کی شہادت کا بیان کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بیکس و مجبور ماں کی تڑپ کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ کس طرح ایک ماں کی ممتا اپنے بچے کی پیاس کی حالت کو دیکھ کر تڑپ اٹھتی ہے اور فریاد کرتی ہے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نامور مرثیہ گو مرزا سلامت علی دبیر کے بارے میں جان سکیں۔
- مرزا سلامت علی دبیر کی مرثیہ نگاری سے واقف ہو سکیں۔
- مرثیے کو صحیح طریقے سے پڑھ سکیں۔

- مرثیہ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کر سکیں۔

6.2 مرثیہ ''بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے''(دبیرؔ)

6.2.1 مرزا دبیر کا تعارف:

مرزا سلامت علی دبیر ایرانی النسل تھے۔ مرزا دبیر کے دادا ملّا رفیع، دہلی کے بادشاہ کے میر منشی تھے۔ 9/اگست 1803ء کو مرزا سلامت علی دبیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ دبیر کے والد مرزا غلام حسین دہلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ آئے۔ اس وقت دبیر کی عمر سات برس کی تھی۔ اس طرح ان کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔

دبیر نے لکھنؤ کے جید علماء سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ صرف، نحو، منطق، ادب اور حکمت غلام ضامن سے پڑھی۔ تفسیر قرآن واصول حدیث اور فقہ کا علم مولوی مرزا کاظم علی سے حاصل کیا۔ مرزا کی طبیعت میں تقدس، پرہیز گاری، خدا پرستی جیسے اوصاف تھے۔ ہمیشہ باوضو رہتے اور مرثیے جائے نماز پر بیٹھ کر تصنیف کرتے تھے۔ شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں میر ضمیر کی شاگردی اختیار کی۔ ضمیر نے خود انہیں دبیر تخلص عطا کیا۔ مرزا دبیر نے مرثیہ نگاری میں بلند مقام حاصل کیا۔

مرزا دبیر اردو کے عظیم شاعر ہیں۔ مرثیہ گوئی میں میر انیس کے معاصر تھے۔ ان کے زمانے میں پورا لکھنؤ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ انیس کے طرفدار ''انیسیے'' اور دبیر کے طرفدار ''دبیریے'' کہلاتے تھے۔ ان کے مرثیے مختلف صنعتوں، تلمیحات، آیات، احادیث، نئی نئی تشبیہوں، استعاروں اور تراکیب سے مزین ہیں۔ انہیں رزم نگاری اور جذبات نگاری پر قدرت حاصل تھی۔ میر انیسؔ فصاحت میں تو مرزا سلامت علی دبیر بلاغت میں مشہور ہیں۔

مرزا دبیرؔ نے 74 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ 12 سال کی عمر سے مرثیے کہنے لگے۔ 62 سال تک اسی دشت کی سیاحی کی۔ ان کے مراثی کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے بہت سارے مراثی 1857ء کے ہنگامے کی نذر ہو گئے۔ محققین نے ایک اندازے کے مطابق ان کے مرثیوں کی تعداد تقریباً دو ہزار کی تعداد بتائی ہے۔

دبیر نے مراثی میں صنائع، بدائع اور لفظی و معنوی خوبیوں کا استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری، سراپا نگاری، رزم نگاری کے بہترین مرقعے ان کے مرثیوں میں ملتے ہیں، مرثیوں سے ان کی علمیت اور لیاقت کا اظہار ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ اردو کے ذخیرہ الفاظ میں بے پناہ اضافہ کیا ہے، بلکہ اردو مرثیے کو علمی وقار عطا کیا۔ ان کے مراثی میں واقعات اور روایات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ انہوں نے تاریخ، روایات، اور معتقدات سے تلمیحات چن چن کر استعمال کیے۔ قرآنی آیات اور احادیث سے اپنے اشعار کو زینت بخشی۔ ان کے مرثیوں میں علمیت، فنی پختگی، زبان و بیان کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ دبیر نے جذبات نگاری، کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ مرزا دبیر جذبات کی تصویریں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والے ان کے ہم نوا ہو جاتے ہیں جیسے ان کے پیش کردہ منظر کو سامنے دیکھ رہے ہوں۔ فضائل کا بیان ہو تو واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور آلام و مصائب کا ذکر ہو تو فلک شگاف نالے بلند ہوتے ہیں۔ سینوں میں دل تڑپ اٹھتے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں۔ لوگ روتے روتے بے ہوش تک ہو جاتے ہیں۔

6.2.2 " بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے" کے منتخب بند:

بانو کے شیرخوار کو ہفتم سے پیاس ہے
بچے کی نبض دیکھ کے ماں بے حواس ہے
نے دودھ ہے نہ پانی کے ملنے کی آس ہے
پھرتی ہے آس پاس پہ جینے سے یاس ہے
کہتی تھی کیا کروں میں دہائی حسین کی
پتلی پھری ہے آج مرے نور عین کی

فریاد یا علی میں کدھر جاؤں یا علی
ان داغوں کو کہاں سے جگر لاؤں یا علی
کس طرح ان کی سانس کو ٹھہراؤں یا علی
پانی کا قحط ہے میں کہاں پاؤں یا علی
بچلے کو آنکھ کھولے تھے اب کھولتے نہیں
روتے نہیں، ہمکتے نہیں، بولتے نہیں

آخر کہا یہ سب نے بلاؤ امام کو
لاؤ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو
نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو
اکبر کی لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں
کوئی پکار لو وہ ابھی ہوں گے راہ میں

منھ پر جوان بیٹے کا تازہ لہو لگائے
ماتم سرا میں گنج شہیداں سے شاہ آئے
جھولے پہ ہاتھ پکڑے ہوئے اہل بیت لائے
بچے کے ہاتھ پاؤں ہلاکر انہیں دکھائے
رو کر کہا کہ سانس فقط آشکار ہے
ہو اس کا کیا حساب کہ دم کا شمار ہے

بیٹھے سرہانے جھولے کے شبیر سرجھکائے
اصغر کے کان سے لب معجز نما ملائے

چپ کے سے کچھ کہا کہ وہ سنتے ہی مسکرائے
سوئے حسینؑ ہاتھ بھی بے ساختہ بڑھائے
بولی سکینہ بابا نے مشکل کشائی کی
اماں مبارک آنکھ کھلی میرے بھائی کی
ہاتھوں پہ اس کو لے کے چلے شاہ کربلا
اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھا ہے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا
اصغر پہ ماں نے ڈال دی اجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرہ پر آب وتاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر
پہنچے قریب فوج تو تیورا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ اڑ گیا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے یہ ہم ان کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں
پھر ہونٹ بے زبان کے چومے جھکا کے سر
روکر کہا جو کہنا تھا سوکہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر
سوکھی زبان تم بھی دکھا دو نکال کر
پھیری زباں لبوں پہ جو اس نور عین نے
تھرّا کے آسمان کو دیکھا حسینؑ نے
مولا فلک کو دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں
لی حرملہ نے شانے سے دو ٹانک کی کماں
ترکش سے جب کہ کھینچ لیا تیر جاں ستاں
چھوڑا کماں سے تاک کے حلقوم بے زباں
چھٹتے ہی حلق بچے کا چھیدا جو تیر نے
تھرّا کے آسمان کو دیکھا صغیر نے

کیا سن تھا تیر کھاتے ہی بچہ دہل گیا
سوکھے گلے سے خون کا دریا ابل گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ تو منکا ڈھل گیا
ٹوپی گری زمین پہ اور دم نکل گیا
ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منھ سے انگوٹھے نکل پڑے

منھ آسماں سے شہ نے پھرایا کہ کیاہوا
دیکھا کہ پار حلق سے تیر جفا ہوا
بچہ تڑپ رہا ہے لہو میں بھرا ہوا
اور ننھا ہاتھ زخم گلو پر دھرا ہوا
آنکھیں پھرائے دیتے ہیں تیور بدلتے ہیں
آگے تو دودھ اگلے تھے اب خون اگلتے ہیں

کھینچا گلے سے بچے کے آہستہ شہ نے تیر
اور ہاتھوں پہ بلند کیا لاشۂ صغیر
گردن جھکا کے بولے کہ اے خالق قدیر
مقبول ہو حسینؑ کا یہ فدیۂ اخیر
ششماہا کوئی کشتۂ تیر ستم نہیں
یہ بے زبان ناقۂ صالح سے کم نہیں

6.2.3 منتخب بند کی تشریح:

اس مرثیہ میں مرزا دبیر نے امام حسینؑ کے فرزند علی اصغر (جن کا سن 6ماہ کا تھا) کی دردناک شہادت کے منظر کو پیش کیا ہے۔

پہلا بند: شہر بانو کا ننھا سا بچہ ساتویں محرم سے پیاسا ہے۔ پیاس کی شدت سے اس کی نبض ڈوب رہی ہے۔ ماں بچے کی نبض دیکھ کے بے چین و بے قرار ہے کہ بچہ کی پیاس کس طرح بجھائی جائے۔ نہ ہی پانی ہے اور نہ ہی دودھ میسر ہے۔ شدت عطش سے بچہ نے آنکھیں موند لی ہیں۔

دوسرا بند: ماں فریاد کرتی ہوئی کہتی ہے کہ یا علی آپ میری مدد کیجئے۔ میں دل کے اس غم کو کیسے برداشت کروں۔ میرا بیٹا پیاس سے نڈھال ہے۔ اب تو اس کی آنکھیں بھی نہیں کھلتیں۔ وہ نہ ہی ہمک سکتا ہے اور نہ ہی رو سکتا ہے۔

تیسرا بند: سب اہل حرم ششماہے کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے اور کہا کہ امام عالی مقام (امام حسین) جناب علی اکبر کی لاش اٹھانے میدان میں گئے ہیں انہیں جلد بلا کر بچہ کے گلے کی خشک رگیں دکھائی جائیں جو شدت پیاس سے نیلی ہوگئی ہیں۔

چوتھا بند: امام حسینؑ اس طرح سے خیمہ میں تشریف لائے کہ چہرہ پر نوجوان بیٹے کا لہو لگا ہوا تھا۔ سب گھر والے (اہل بیت) آپ کا بازو تھام کر جھولے کے قریب لائے اور کہا کہ بچہ پیاس سے نڈھال ہے۔ صرف سانس چل رہی ہے۔ بس کوئی دم کا مہمان ہے۔

پانچواں بند: امام عالی مقام (امام حسین) سر جھکا کر جھولے کے قریب بیٹھ گئے اور جناب علی اصغر کے کان میں کچھ کہا۔ جس کو سنتے ہی ششماہے نے مسکرا کر اپنے ہاتھ بابا کی جانب بڑھا دیئے۔ امام حسین کی چھوٹی صاحبزادی سکینہؑ نے کہا بابا نے مشکل کشائی کی اور میرے بھائی نے آنکھیں کھول دیں۔

چھٹا بند: امام علی مقام (امام حسین) ننھے سے مجاہد کو ہاتھوں پر لے کر میدان جنگ میں چلے۔ گرمی کی شدت تھی۔ جناب شہر بانو نے بچہ کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے ایک اجلی سی چادر اڑھا دی۔ علی اصغر کی خوبصورتی کا یہ عالم تھا کہ وہ سفید چادر ایسے نظر آتی تھی جیسے چمکتے ہوئے سورج پر ابر آ گیا ہو۔

ساتواں بند: جب بچہ کو لے کر امام حسین فوج کے قریب پہنچے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ آپ رحمت اللعالمین کے نواسے تھے۔ آپ کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ دشمنان اسلام سے پانی طلب کریں۔ صرف شیر خوار کے چہرے سے چادر کو ہٹا کر کہا کہ اصغر تمہارے پاس کچھ غرض لے کر آئے ہیں۔

آٹھواں بند: اس بند میں مرزا دبیر نے امام عالی مقام کی مظلومی کو پیش کیا ہے۔ امام حسین جناب علی اصغر کے ہونٹ چوم کر کہتے ہیں "بیٹا تمہارا پدر کہہ چکا۔ اب تم بھی اپنی سوکھی زبان نکال کر دکھلا دو۔" جیسے ہی امام عالی مقام امام حسینؑ نے کہا ششماہے نے اپنے ہونٹوں پر سوکھی زبان کو پھیرنا شروع کر دیا۔ بچہ کے اس عمل کو دیکھ کر امام حسین نے کانپتے ہوئے آسمان پر نظر کی۔

نواں بند: ابھی امام حسین آسمان کو دیکھ ہی رہے تھے کہ حرملہ (تیر انداز) نے ننھے سے علی اصغر کے گلے کا نشانہ باندھ کر تیر کمان سے چھوڑا۔ جیسے ہی تیر حلق کو چھیدا ننھے سے مجاہد نے تھرا کے آسمان کی جانب نظر کی۔

دسواں بند: علی اصغر انتہائی کمسن تھے۔ تیر کھانے کے قابل نہ تھے۔ سوکھے گلے سے خون کا دریا بہنے لگا۔ باپ کے ہاتھوں پر چھ ماہ کا بیٹا تڑپ کر جو مچلا تو ٹوپی زمین پر گر گئی۔ ننھی سی کلائیوں میں تشنج ہونے لگا۔

گیارہواں بند: امام حسین نے پلٹ کر دیکھا تو عجیب منظر تھا۔ ننھا سا فرزند اپنے ہاتھوں کو زخم پر رکھے خون میں بھرا ہوا تڑپ رہا ہے۔ چہرہ کے تیور بدل رہے ہیں۔ کبھی تو یہ ششماہا دودھ اگلتا تھا اب خون اگل رہا ہے۔

بارہواں بند: اس بند میں دبیر نے امام حسین کی بیکسی کو پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں امام عالی مقام نے آہستہ سے بچے کے گلے سے تیر کھینچا اور ہاتھوں پر ننھے سے شیر خوار کو بلند کر کے گردن جھکا کر کہا "اے پروردگار حسین کی اس آخری قربانی کو قبول فرما۔ کیوں کہ اب شہید ہونے کے لیے کوئی بچا ہی نہیں ہے اور یہ بے زبان ششماہا ناقۂ صالح سے کم نہیں ہے۔"

6.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- مرزا سلامت علی دبیر نے صنف مرثیہ کو آسمان کی بلندی پر پہنچا دیا۔ میر انیس سلاست وروانی میں تو مرزا دبیر فصاحت وبلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

- مرزا دبیر کا پورا نام مرزا سلامت علی تھا۔ دبیرؔ تخلص کرتے تھے۔ 9/ اگست 1803ء کو مرزا سلامت علی دبیر دہلی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے 74 سال کی عمر پائی۔
- اس مرثیہ میں دبیر نے حضرت امام حسینؑ کے چھے ماہ کے شیر خوار صاحبزادے جناب علی اصغر کی پیاس اور شہادت کو بہت ہی دردناک انداز میں پیش کیا ہے۔ جناب علی اصغر حضرت امام عالی مقام کے سب سے چھوٹے فرزند تھے جنہیں کربلا میں تیر مار کر شہید کر دیا گیا۔
- دبیر نے مراثی میں صنائع، بدائع لفظی اور معنوی کا استعمال کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری، سراپا نگاری، رزم نگاری کے بہترین مرقعے ان کے مرثیوں میں ملتے ہیں۔

6.4 مشکل الفاظ

ہفتم	سات	Seventh
لہو	خون	Blood
قتل گاہ	قتل ہونے کا مقام	Place of killing, Execution Spot
گنجِ شہیداں	میدان کربلا میں وہ جگہ جہاں شہدا کے لاشے دفن کیے گئے	Martyrs' field (place in Karbala where martyrs were buried)
معجز نما	اعجاز دکھانے والا	Miracle-like, showing a miracle
مشکل کشائی	مدد کرنا، مشکل دور کرنا	Helping, Removing difficulty
پسر	بیٹا	Son
پدر	باپ	Father
ترکش	جس میں تیر رکھے جاتے ہیں	Quiver (to hold arrows)
تشنج	اینٹھن، جسمانی عضلات کا کھنچنا	Spasm, muscle contraction
گلو	گلا	Throat
تیورانا	چکر آجانا، آنکھوں میں اندھیرا چھا جانا	Fainting, eyes going dark
شیر خوار	دودھ پینے والا	Infant, one who drinks milk
مجاہد	جہاد کرنے والا	Fighter for a cause, warrior
ناقہ صالح	حضرت صالح کی اونٹنی جو خدا کی بھیجی ہوئی تھی، لیکن قوم نے سرکشی کرکے اس کے پیر کاٹ دیے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا	Prophet Saleh's she-camel (sacred camel sent by God)
بانو	حضرت امام حسینؑ کی بیوی جو شاہ ایران کی پوتی تھیں	Lady, wife (e.g., wife of Imam Hussain)

6.5 مشقیں

مشق 1: نیچے دیے گئے الفاظ کے معنی لکھ کر ان کے جملے بنائیے۔

شیر خوار : ....

لہو : ....

مجاہد : ....

پسر : ....

گلو : ....

6.6 نمونہ امتحانی سوالات

6.6.1 معروضی سوالات:

(1) دبیر کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(a) دہلی (b) آگرہ (c) فیض آباد (d) لکھنؤ

(2) دبیر کے طرفدار کیا کہلاتے تھے؟

(a) انیسیے (b) دبیریے (c) خلیقیے (d) ضمیریے

(3) حضرت علی اصغرؑ کا سن کیا تھا؟

(a) ایک سال (b) چار مہینہ (c) چھ مہینہ (d) آٹھ مہینہ

(4) مرثیے میں شیر خوار سے کون مراد ہے؟

(a) حضرت قاسمؑ (b) جناب علی اکبرؑ (c) جناب علی اصغرؑ (d) جناب سکینہؑ

(5) ہفتم کے کیا معنی ہیں؟

(a) دس (b) چھ (c) آٹھ (d) سات

(6) دبیر نے کتنی سال کی عمر میں وفات پائی؟

(a) 75 (b) 74 (c) 70 (d) 78

(7) پسر کسے کہتے ہیں؟

(a) دادا کو (b) چچا کو (c) لڑکے کو (d) باپ کو

(8) دبیر کے والد کا نام کیا تھا؟

(a) میر حسن (b) مرزا غلام حسین (c) مرزا رسوا (d) میر ضمیر

(9) دبیر نے اس مرثیے میں کس کی شہادت بیان کی ہے؟

(a) حضرت علی اکبرؑ (b) حضرت علی اصغرؑ (c) امام حسینؑ (d) حضرت عباس

(10) دبیر کی وفات کہاں ہوئی؟

(a) حیدرآباد (b) فیض آباد (c) دہلی (d) لکھنؤ

6.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. دبیر کی مرثیہ گوئی کی خصوصیات بیان کیجئے۔
2. ذیل کے بند کی تشریح کیجیے۔

پہنچے قریب فوج تو تیورا کے رہ گئے
چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ اڑ گیا تھرا کے رہ گئے
چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے یہ ہم ان کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

3. پہلے بند کی تشریح کیجیے۔
4. تیسرے بند میں دبیر نے کیا بیان کیا ہے؟ لکھیے۔
5. حضرت علی اصغرؑ کے بارے میں چند جملے لکھیے۔

6.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. مرزا سلامت علی دبیرؔ کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. مرثیہ "بانو کے شیر خوار کو ہفتم سے پیاس ہے" کا خلاصہ لکھیے۔
3. ذیل کے بندوں کی تشریح کیجئے۔

(1)

کیا سن تھا تیر کھاتے ہی بچہ دہل گیا
سوکھے گلے سے خون کا دریا ابل گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ تو منکا ڈھل گیا
ٹوپی گری زمین پہ اور دم نکل گیا
ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منہ سے انگوٹھے نکل پڑے

(2)

آخر کہا یہ سب نے بلاؤ امام کو
لاؤ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو
نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو
اکبر کی لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں
کوئی پکار لو وہ ابھی ہوں گے راہ میں

6.6.1 کے جوابات:

(i) A	(ii) B	(iii) C	(iv) C	(v) D
(vi) B	(vii) C	(viii) B	(ix) B	(x) D

اکائی 7 : غزل

میر تقی میر، مرزا غالب

اکائی کے اجزا

7.0		تمہید
7.1		مقاصد
7.2		میر تقی میرؔ
	7.2.1	حالات زندگی
	7.2.2	غزل گوئی
	7.2.3	غزل
	7.2.4	تشریح
7.3		مرزا غالبؔ
	7.3.1	حالات زندگی
	7.3.2	غزل گوئی
	7.3.3	غزل
	7.3.4	تشریح
7.4		اکتسابی نتائج
7.5		مشکل الفاظ
7.6		مشقیں
7.7		نمونہ امتحانی سوالات

7.0 تمہید

اردو شاعری کا ابتدائی دور مثنویوں کا دور رہا ہے۔ شمالی ہند اور خصوصا دکن میں بے شمار مثنویاں لکھی گئیں۔ دکن کو مثنویوں کی سرزمین کہا جاتا ہے لیکن شمالی ہند میں مثنوی کے علاوہ اردو غزل بھی اسی مٹی کی مرہون منت ہے۔ جب تک ولیؔ دکنی کا دیوان دہلی نہیں پہنچا تھا تب تک وہاں کی غزل پر فارسی کا غلبہ تھا۔ آہستہ آہستہ غزل کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔ غزل نے ترقی اور تنزلی کے کئی دور دیکھے لیکن ہر دور میں کم و بیش سست رفتاری سے اس کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ اس نے ہر دور میں ایسے شعرا کو جنم دیا جنھوں نے غزل کے

دامن میں بیش بہا اضافے کیے۔یوں تو میرؔ کو اردو غزل میں خدائے سخن کا درجہ حاصل ہے لیکن فلسفہ کے میدان میں غالبؔ کو بھی خدائے سخن کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس اکائی میں ہم انہی شعرا کی غزل گوئی کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی غزلوں کی تشریح کا بھی مطالعہ کریں گے۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- میر تقی میرؔ،اور غالبؔ کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- میر تقی میرؔ،اور غالبؔ کی غزلوں کی خصوصیات کو واضح کر سکیں۔
- میر تقی میرؔ،اور غالبؔ کی شامل نصاب غزلوں کی تشریح کر سکیں۔

7.2 میر تقی میرؔ

7.2.1 حالات زندگی :

میر کا اصل نام محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔والد کا نام میر محمد علی اور لقب علی متقی تھا۔میرؔ آگرہ میں 23-1722ء مطابق 1135ھ کو پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن کا زمانہ آگرہ میں ہی گزرا۔والد کی وفات کے بعد گیارہ سال کی عمر میں دہلی آ گئے،وہاں پر صمصام الدولہ کے بھتیجے خواجہ محمد باسط سے ملاقات ہوئی جنہوں نے میرؔ کو نواب صمصام الدولہ کے یہاں ایک روپیہ یومیہ پر ملازمت دلا دی لیکن نادر شاہ سے جنگ میں جب صمصام الدولہ کا قتل ہو گیا تو میر کی ملازمت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد میرؔ آگرہ واپس چلے آئے۔ کچھ دن آگرہ میں گزارے لیکن معاش کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو دوبارہ دہلی کا رُخ کیا۔

میرؔ کے والد نے دو شادیاں کیں جن میں پہلی شادی خان آرزو کی بہن سے ہوئی تھی۔ میرؔ دوسری بیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔اس طرح خان آرزوؔ میر کے سوتیلے ماموں ہوئے۔ میر جب دوبارہ دہلی پہنچے تو خان آرزوؔ کے یہاں مہمان ہوئے، لیکن بعد میں جب خان آرزو کا سلوک بدل گیا تو میرؔ کو پریشانی اٹھانی پڑی اور وہ ان سے نالاں رہنے لگے۔ میر نہایت حساس طبعیت کے مالک تھے۔ حالات کے سبب انہیں سخت صدمہ پہنچا اور جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ علاج کرایا تو افاقہ ہوا۔ سید سعادت خان امروہوی نے ریختہ کی طرف میر کو توجہ دلائی۔ محمد تقی نے میرؔ تخلص اختیار کیا اور جلد ہی ریختہ گوئی میں کمال حاصل کیا اور مقبول خاص وعام ہوئے۔

میرؔ نے دہلی کے ویران ہونے اور دوبارہ بسنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ لکھنؤ میں اس وقت نواب آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ 1196ھ کے اوائل میں آصف الدولہ نے میر کو لکھنؤ بلا لیا اور دو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ نواب نے اپنا کلام سنایا اور درباری ملازمین میں شامل کر لیا۔ نواب آصف الدولہ میرؔ کے بڑے قدر دان تھے۔ وہ انہیں شکار پر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ اس زمانے میں لکھنؤ شعر وشاعری کا مرکز تھا اور دہلی کی بربادی اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اہل کمال لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے۔ مصحفی اور انشا بھی لکھنؤ میں ہی مقیم تھے۔

لکھنؤ آنے کے بعد میر آخری دم تک لکھنؤ میں ہی رہے لیکن انہیں لکھنؤ سے وہ والہانہ محبت نہ ہو سکی جو دہلی سے تھی۔ آخر کار 20/ شعبان 1225ھ مطابق 21/ ستمبر 1810ء کو نوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔ لکھنؤ سٹی اسٹیشن کے پاس بھیم کا اکھاڑا (بھیم کا تکیہ) قبرستان میں دفن ہوئے لیکن اب قبر کا نشان بھی موجود نہیں ہے۔

7.2.2 غزل گوئی:

میر کی طبیعت میں شعر گوئی کی صلاحیت پیدائشی تھی۔ شاعری ان کی زندگی کا جزو لازم تھی۔ ان کے کلام کا اردو میں وہی مقام ہے جو فارسی میں سعدی شیرازی کی شاعری کا ہے۔ میر ان شعرا میں سے ہیں جن کا نام رہتی دنیا تک زندہ جاوید رہے گا۔ میرؔ کے اشعار سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے:

جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز
تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

میرؔ کے ہم عصر اور ان کے بعد آنے والے شعرا نے بھی میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ سودا، مصحفی، غالب، ناسخ، حسرت اور ذوق نے بھی میر کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ ذوق کہتے ہیں:

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر کے اشعار کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے کلام میں اردو کی متعدد اصناف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ غزل، مثنوی اور واسوخت میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی شاعری دل اور دلی کا مرثیہ ہے۔ ان کی غزلیں درد و غم اور سوز و گداز سے پُر ہیں۔ رنج، ناامیدی اور مایوسی کے جذبات کو بڑے موثر انداز میں انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں:

ہم کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

میرؔ کی شاعری ان کی زندگی کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کی شاعری آپ بیتی ہے۔ ان کے اپنے درد، کرب اور تجربات کا اظہار ہے۔ وہ خود کو سہل نہیں کہتے، وہ خواص کے پسندیدہ ہیں لیکن ان کی شاعری عوام کے لیے ہے۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میرؔ کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ وہ نہایت مناسب اور موزوں الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں سادگی کے ساتھ گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے۔ کبھی غنائی لہجہ اور کبھی استفہامیہ لہجے سے کلام میں حسن پیدا کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے:

چلتے ہو تو چمن کو چلیے، کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں، کم کم باد و باراں ہے

اردو کے تقریباً سبھی ناقدین نے میرؔ کی شاعری کو دل اور دلی کی شاعری کہا ہے۔ میر کی زندگی کا ایک بڑا عرصہ دلی میں گزرا اس لیے اس تذکرے کے بغیر میر کی شاعری کی تکمیل نہیں ہوتی۔ میر کے زمانے میں دلی کئی بار لٹی اور اجڑی۔ میر نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لیے یہ ان کی شاعری کا حصہ بن گیا ہے۔ ان کی غزلوں میں درد، کرب اور غم ان کا ذاتی نہیں بلکہ دلی کی ویرانی کے ہی مناظر ہیں:

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

میرؔ تغزل کے استاد کہلاتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بڑا سرمایہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کی شاعری کے چھے اردو اور ایک فارسی کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔ میر نے نثر میں جو کتابیں لکھی ہیں ان میں ' نکات الشعرا' کا نام سب سے اہم ہے۔ اس کے علاوہ 'فیض میر' اور 'ذکر میر' کو بھی ان کی نثری کاوشوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

میرؔ نے بیک وقت عشق و عاشقی کے موضوعات بھی باندھے، خود کو محبوب کا معتوب بھی کہا اور واسوخت کے ذریعے اس کو برا بھلا بھی کہا۔ وہ شاعر جو 'پاس ناموس عشق' کی خاطر اپنی پلک تک آنسو بھی نہیں آنے دیتا، وہ اپنی مثنوی 'اژدر نامہ' میں اپنے معاصرین پر لعن طعن کرتا ہے۔ غزل کے علاوہ میرؔ نے 'خواب و خیال' اور 'دریائے عشق' مثنویاں لکھ کر اردو مثنوی کو بام عروج تک پہنچا دیا ہے۔ میرؔ کی شخصیت کی یہی وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے اردو میں انہیں خدائے سخن کا درجہ حاصل ہے۔

7.2.3 غزل:

هستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمائش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
چشم دل کھول اس بھی عالم پر — یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں — حالت اب اضطراب کی سی ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز — اسی خانہ خراب کی سی ہے
آتش غم میں دل بھنا شاید — دیر سے بو کباب کی سی ہے
میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے

غزل کے مشکل الفاظ کے معنی

هستی : وجود، زندگی، ہونا

حباب	:	پانی کا بلبلا، جھاگ کا چھوٹا سا گولا
نمائش	:	دکھاوا، کسی چیز کو ظاہر یا پیش کرنا
سراب	:	دھوکہ دینے والا منظر، ریگستان میں دور لہریں مارتا پانی نظر آتا ہے جو فی الحقیقت نظر کا دھوکا ہوتا ہے۔
پنکھڑی	:	پھول کی پتّی
چشم دل	:	دل کی آنکھ، باطنی بصیرت یا روحانی نظر
اوقات	:	وقت (جمع)، حیثیت یا مقام (طنزیہ انداز میں بھی)
اضطراب	:	بے چینی، بے قراری، دل کا بے سکون ہونا
خانہ خراب	:	برباد، بے گھر، مصیبت زدہ (اکثر طنز یا ہمدردی کے انداز میں)
آتش غم	:	غم کی آگ، شدید دکھ یا درد کا استعارہ
بو	:	خوشبو یا بدبو، کسی چیز کی مہک
نیم باز	:	آدھا کھلا ہوا (اکثر آنکھ یا دروازے کے لیے استعمال ہوتا ہے)
مستی	:	سرشاری، خوشی یا وجد کی حالت، بے خودی

7.2.4 تشریح:

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

اس شعر میں شاعر زندگی پر غور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ زندگی پانی کا بلبلہ ہے۔ انسان کی دنیاوی زندگی بلبلے کی طرح عارضی ہے جو ہمیشہ کے لیے نہیں ہے۔ دنیا کی زندگی ہمیشگی کی زندگی نہیں ہے یہ تو بس ایک فریب ہے خواب ہے۔ زندگی صحرا کا سراب ہے جو دور سے دیکھنے پر پانی معلوم ہوتا ہے۔ پیاسے اس پانی کی جستجو میں سفر کرتے جاتے ہیں مگر وہ سراب جو پانی ہے ہی نہیں دور ہوتا جاتا ہے بالکل ایسے ہی یہ سب کچھ دھوکے کا سامان ہے، حقیقت صرف موت ہے۔ انسان، دنیا اور دنیا کی نمود و نمائش سب ایک دھوکا ہے۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اس شعر میں شاعر نے اپنے محبوب کے ہونٹوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کو گلاب کے پھول کی پتی سے تشبیہ دی ہے محبوب کے ہونٹ نہایت نرم و نازک ہیں۔ ان پر گلاب کی سی سرخی ہے۔ شاعر اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتا ہے تو روایت سے ہٹ کر نئی باتیں نکالتا ہے، میرؔ نے محبوب کے گلابی ہونٹوں کی تعریف کی ہے۔ اور انہیں نرمی، نزاکت اور رنگت کی بنا پر گلاب کی

پنکھڑی سے تشبیہ دی ہے۔

چشم دل کھول اس بھی عالم پر
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے

اس شعر میں وہ انسانوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے انسان تم دنیا کے دھوکے میں کھو گئے ہو یہ سب تو دھوکا اور فریب ہے۔ تم جس دنیامیں مصروف ہو یہ کھیل تماشہ چار دن کا ہے مگر جو خدا کی ذات جاویداں ہے اسے بھول بیٹھے ہو۔ اس دنیا کے دھوکے میں مستغرق ہونے سے اچھا ہے اللہ کی یاد میں وقت لگاؤ تا کہ تم اس کی نظر میں آجاؤ۔ اس شعر میں میر نے ہمیں دنیا کی حقیقت دکھائی ہے وہ دنیا کو خواب سے تشبیہ دیتے کہ جیسے خواب حقیقت نہیں ہوتا ویسے ہی یہ دنیا بھی حقیقت کی زندگی نہیں ہے۔ محض ایک خواب یا خیال ہے۔

بار بار اس کے در پہ جاتا ہوں
حالت اب اضطراب کی سی ہے

اس شعر میں وہ کہتے ہیں کہ یار کے دیدار کے لیے بار بار اس کے کوچے میں جاتا ہوں مگر میری تمنا پوری نہیں ہوتی۔ میں کوچہ یار سے ناکام لوٹتا ہوں۔ محبوب کا نظر انداز کرنا اور بے رخی برتنا مجھے اپنے مقصد میں ناکام کر دیتا ہے۔ میرے مقدر میں ناکامی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر میں ہمت نہیں ہاروں گا بار بار محبوب کے در پر جا کر اپنی تمنا کو پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں جو اس کے کوچہ کو جاتا ہوں اور ناکام لوٹ آتا ہوں۔ یہ جانا آنا یہ میرے اختیار میں نہیں میرے قدم خود اس جانب اٹھ جاتے ہیں۔ محبوب کی بے رخی اور اپنے بے چین دل کے ہاتھوں قرار نصیب نہیں۔

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اسی خانہ خراب کی سی ہے

اس شعر میں کہتے ہیں کہ جب محبوب سے بات کرنے کو میں نے لب وا کیے تو پھر وہی بے رخی کا سامنا کرنا پڑا۔ میری صدائیں سن کر جب محبوب نے ناگواری سے کہا یہ آواز اسی خستہ حال عاشق کی ہے تو میرا دل اضطراب کی کیفیت میں چلا گیا۔ اس کی بے رخی تو اپنی جگہ مگر جب وہ مجھ دیکھ کر ناگواری سے مجھے برباد اور تباہ حال کہتا ہے تو مجھے مزید تکلیف ہوتی ہے۔

آتش غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

دل غموں کے شعلوں میں بھنا جاتا ہے۔ یہ آگ جو دل کو اندر سے جلا رہی ہے یہ زمانے بھر کے ستم ہیں۔ اب دل جل جل کر بھن چکا ہے اس لیے اب وہ کباب کی سی بو پھیلا رہا ہے۔ محبوب جس قدر مجھ سے بے رخی اور ناروا سلوک کرتا ہے میرا دل جل جل کر کباب کی طرح بو دینے لگ گیا ہے۔

میرؔ ان نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

اس شعر میں محبوب کی آنکھوں کے حسن کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کی مخمور آنکھوں میں شراب کے جیسا نشہ بھرا ہوا ہے۔ وہ کسی کو آنکھ بھر کر دیکھ لے تو اسے اپنا اسیر بنالیتا ہے۔ وہ لاکھ بے رخی سے پیش آئے مگر جب اپنی مخمور آنکھوں سے جب دیکھتا ہے تو شاعر کا دل لوٹ لیتا ہے۔ شاعر اپنے محبوب کی ہر ادا کا اسیر ہے وہ اپنے محبوب کی ادھ کھلی مخمور آنکھ کا بھی شیدائی ہے۔ جیسے ایک شرابی شراب کے نشے میں مست ہو جاتا ہے اسی طرح محبوب کی آنکھوں میں بھی ایسی خمار کی کیفیت ہے جو انسان کے ہوش اڑا دیتی ہے۔

7.3 مرزا غالبؔ

7.3.1 حالات زندگی :

غالب کا اصل نام مرزا اسد اللہ خاں اور تخلص غالبؔ تھا، 27/ دسمبر 1797ء مطابق 8/ رجب 1212ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔ غالب اپنے آپ کو نسلاً ترک کہتے تھے اور ان کے اجداد کی زبان ترکی تھی۔ ان کے والد کا نام عبد اللہ بیگ تھا اور چچا نصر اللہ بیگ خاں فوج میں ملازم تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے چچا نے ان کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ ابھی آٹھ سال کے ہوئے تھے کہ چچا ایک معرکے میں لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس کے بعد انگریزی حکومت کی جانب سے پنشن جاری ہوگئی۔ مرزا کی ابتدائی تعلیم رسمی انداز میں ہوئی۔ مولوی معظم سے فارسی کا درس لیا۔ بعد میں ملا عبد الصمد نے فارسی زبان و ادب سے روشناس کرایا۔

غالب جب آگرہ سے دہلی آئے تو انہیں یہاں بڑی بڑی ہستیوں کی صحبت حاصل ہوئی جن سے انہوں نے فیض حاصل کیا۔ یہ تمام لوگ غالب کے ساتھ شفقت اور عزت کا سلوک کرتے تھے۔ غالب کی طبیعت حوصلہ مند اور ہاتھ کشادہ تھا۔ خرچ آمدنی سے زیادہ تھا۔ لوگوں سے قرض لے کر گزارہ کرتے اور شراب پیتے تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس بات کو چھپایا نہیں۔

غالب کی زندگی تنگ دستی میں گزری۔ ان کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ انہوں نے 1857 کے انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ استاد ذوق کے بعد غالب بہادر شاہ ظفر کے کلام پر اصلاح دیتے تھے لیکن 1857 کی جنگ کے بعد مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور دربار کا سہارا ختم ہو گیا۔ انگریزی سرکار کی طرف سے ملنے والی پنشن بھی بند کر دی گئی۔ انہوں نے پنشن کی بحالی کی بڑی کوشش کی، اس کے لیے کلکتہ کا سفر بھی کیا لیکن مایوسی کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر کار رامپور پہنچے اور وہاں کے نواب نے سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کے تین سال بعد پنشن بھی بحال ہو گئی لیکن ان کا تمام پیسہ قرض اور سود میں چلا گیا۔ عمر کے آخری حصے میں انھیں مختلف امراض نے آگھیرا تھا۔ مختلف بیماریوں کے سبب 1869ء میں اردو کے اس عظیم شاعر کا انتقال ہوا۔

7.3.2 غزل گوئی:

غالب ہر عہد کے بڑے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں واردات عشق کے علاوہ تصوف، فلسفہ، تخیل، تہہ داری، مشکل گوئی، انانیت، طنز و ظرافت اور آفاقیت سب کچھ شامل ہے۔ غالب کی شاعرانہ عظمت کو چند صفحات میں سمیٹنا بہت مشکل ہے لہٰذا یہاں ان کی شاعری کی چند اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔

عام طور پر غالب کا تعارف ایک مشکل پسند شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن دیوان غالب صرف مشکل اشعار کا کلیات نہیں بلکہ مختلف النوع اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس میں سہل ممتنع بھی ہے اور فارسی تراکیب کا استعمال بھی ہے۔ ایک طرف ان کے اشعار میں تہہ داری ہے تو دوسری طرف آسان اور معنی خیز اشعار بھی ہیں۔ غالب کے زمانے میں بھی لوگوں کو ان کے اشعار میں تہہ داری اور مشکل پسندی کی شکایت تھی۔

غالب آہستہ آہستہ سہل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے کلام کا انتخاب کیا۔ انہوں نے اس انتخاب میں سہل ممتنع کی پوری پوری غزلیں شامل کی ہیں۔ سہل ممتنع کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شعر جو سننے میں آسان لگے اور سن کر یہ احساس ہو کہ یہ تو میں بھی کہہ سکتا ہوں لیکن کہانہ جائے۔ غالب کے کلام میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں:

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غالب نے دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا گوارہ نہ کیا بلکہ اپنی روش آپ بنائی۔ ان کے مزاج میں شوخی اور ظرافت تھی جس کے جابجا ثبوت ان کے خطوط میں مل جاتے ہیں۔ ان میں قدم قدم پر لطیفے اور دلچسپ واقعات ملتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک فلسفیانہ فکر بھی موجود ہے۔ وہ کائنات کے مظاہر پر غور و فکر کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں استفہامیہ لہجے کا خوب استعمال ہوا ہے۔ وہ فلسفی نہیں تھے مگر ان کا انداز فلسفیانہ تھا:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

تصوف کے معاملے میں غالب وحدۃ الوجود کے پیروکار تھے۔ انہیں اپنی متصوفانہ شاعری پر ناز تھا۔ غالب نے اپنے کلام میں تصوف کے مسائل کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے ، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالب سے قبل اردو غزل فکری عنصر سے محروم تھی۔ شعرا بالعموم عشقیہ مضامین کو سیدھے سادے پیرائے میں نظم کر دیتے تھے۔ ان شعرا میں اس سے آگے بڑھ کر کچھ سوچنے کی طاقت نہ تھی لیکن غالب کی غزل میں فکری عنصر معراج کمال پر نظر آتا ہے۔

7.3.3 غزل

کوئی امید بر نہیں آتی   کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں میری آواز گر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ شرم تم کو مگر نہیں آتی

غزل کے مشکل الفاظ کے معنی

امید بر آنا	:	امید پوری ہونا، تمنا یا خواہش کا پورا ہو جانا
معین	:	مقرر، طے شدہ، متعین
طاعت وزہد	:	عبادت اور پرہیز گاری، دین داری
داغ دل	:	دل کا زخم، جذباتی یا عشقیہ دکھ
چارہ گر	:	علاج کرنے والا، مدد کرنے والا، مسئلہ حل کرنے والا
مگر	:	شاید

7.3.4 تشریح

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

غالب کہتے ہیں کہ نہ تو میری کوئی اُمید بر آتی ہے اور نہ اُمید بر آنے کی کوئی صورت نظر آتی ہے۔ مراد یہ کہ ساری عمر نامرادی میں بسر ہو گئی اور آگے بھی مرادیں بر آنے کی کوئی امید نہیں ہے۔

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

موت تو بیشک اپنے وقت مقررہ پر آئے گی۔ نہ اس سے پہلے آسکتی ہے اور نہ وقت ٹلنے کے بعد۔ لیکن اس نیند کو کیا ہو گیا ہے؟

اس کا تو موت کی طرح کوئی وقت مقرر نہیں ہے، یہ تو کسی وقت بھی آسکتی ہے لیکن یہ رات بھر مجھے ترساتی کیوں رہتی ہے۔ پوری رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ شعر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ موت کا ایک دن تو مقرر ہے یعنی وہ تو اپنے مقررہ وقت پر آئے گی، پھر موت کے خوف سے رات بھر نیند کیوں نہیں آتی؟

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

پہلے یہ حالت تھی کہ کبھی مجھے اپنے حالِ زار پر ہنسی آجاتی تھی کہ میں نے اپنی کیسی شکل بنالی ہے لیکن اب اُداسی اور مایوسی کی یہ حالت ہے اب مجھے اپنے حال پر ہنسی نہیں آتی۔ یہ صورت حال تب ہوتی ہے جب افسردگی اور اُداسی، تباہ حالی اور بربادی حد سے بڑھ جائے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

غالب کہتے ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ طاعت اور زہد پر آخرت میں انسان کا فیصلہ ہو گا۔ لیکن میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں، اس لیے اجر کے بدلے جنت ملنے کی امید پر بھی عبادت نہیں کرنا چاہتا، کیوں کہ ایسی عبادت میں کچھ حاصل ہونے کی امید شامل ہے۔ کچھ ملنے کی امید پر عبادت کرنا خود طاعت و زہد کی توہین ہے۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کچھ ایسی بات ہے جس کی وجہ سے میں بات نہیں کرتا اور خاموشی اختیار کیے ہوئے ہوں۔ ورنہ یہ بات نہیں کہ میں بات کرنا نہیں جانتا۔ مجھے بات کرنا خوب آتا ہے گویا شاعر کسی مصلحت کی وجہ سے خاموش ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا ہے۔

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

چونکہ معشوق کو ہر وقت میرا رونا ہی پسند ہے اس لیے میں کیوں نہ اس کو رو رو کر یاد کروں۔ اس شعر میں عشقِ حقیقی کا بھی پہلو ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کا رو رو کر دعا کرنا پسند ہے۔ اس لیے میں کیوں نہ اس کو رو رو کر یاد کروں کہ میری دعا قبول ہو۔

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

اے چارہ گر! اگر تجھے میرے دل کا داغ نظر نہیں آتا تو کیا تجھے دل کے جلنے کی بو بھی نہیں آتی؟ یعنی کیا تجھے میری بے چینی، اضطراب، تڑپ، جلن، رنج اور مایوسی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

جب کوئی عاشق عشق کے آخری مقام پر پہنچ جاتا ہے تو اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے کہ اسے خود کی بھی خبر نہیں ہوتی۔ یا یوں کہیں کہ بندہ عشق حقیقی میں اس قدر غرق ہو چکا ہے کہ اسے اپنی ہی خبر نہیں رہی۔ عشق کی انتہا یہ ہے کہ عاشق معشوق کے خیال میں اپنے وجود اور اپنی ہستی کو بھلا دے۔ شعر میں اسی کیفیت کا ذکر ہے۔

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

شاعر کہتا ہے کہ میری شدید خواہش ہے کہ مصائب و آلام سے بھری اس زندگی سے نجات مل جائے اور موت آ جائے۔ لیکن میری یہ خواہش بھی پوری نہیں ہوئی۔ اس خواہش کے پورا ہونے کی فکر میں، میں اس قدر اذیت و تکلیف سے گزرتا ہوں جو موت کی اذیت سے کسی قدر کم نہیں ہے۔ گویا میں مر جانے کی آرزو میں موت کی اذیت سے گزرتا ہوں اور اس طرح میں بار بار مرتا رہتا ہوں لیکن اگر حقیقی طور پر موت آ جاتی تو میری جان چھوٹتی لیکن چاہتے ہوئے موت بھی نہیں آ رہی ہے۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالب اپنے آپ سے مخاطب ہو کر طنزیہ لہجے میں کہتے ہیں کہ تم نے تو اپنی ساری عمر گناہوں میں گزار دی اور اب حج کرنے چلے ہو۔ اب تم کس منہ سے کعبہ جاؤ گے ؟ کیا تمہیں اپنے اعمال بد دیکھ کر شرم نہیں آتی کہ کیا منہ لے کر خدا کے گھر جاؤں؟ گویا اگر تمہیں شرم ہوتی تو تم وہاں جانے سے کتراتے لیکن ظاہر ہے کہ تم بے شرم ہو اور تمہیں اپنے گناہوں پر کوئی ندامت نہیں ہے۔ اور بے شرم ہو کر حج کرنے چلے ہو۔

7.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- میر کا اصل نام محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ والد کا نام میر محمد علی اور لقب علی متقی تھا۔ ان کی پیدائش 1135ھ مطابق 1722-23ء میں آگرہ میں ہوئی۔ اردو کے نامور استاد شاعر خان آرزو میر کے سوتیلے ماموں تھے۔
- والد کی وفات کے بعد گیارہ سال کی عمر میں دہلی آ گئے، وہاں پر صمصام الدولہ نے ایک روپیہ یومیہ پر ملازمت پر رکھ لیا لیکن صمصام الدولہ کے قتل کے بعد وظیفہ ختم ہو گیا۔
- جب دہلی ویران ہوئی تو میر لکھنؤ آ گئے اور آخری دم تک لکھنؤ میں ہی رہے لیکن انہیں لکھنؤ سے وہ والہانہ محبت نہ ہو سکی جو دہلی سے تھی۔ آخر کار 20/ شعبان 1225ھ مطابق 21/ ستمبر 1810ء کو نوے سال کی عمر میں جہانِ فانی سے کوچ کیا۔
- میرؔ کے کلام میں اردو کی متعدد اصناف سخن کے نمونے ملتے ہیں۔ غزل میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ انہوں نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔
- میرؔ کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ وہ نہایت مناسب اور موزوں الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔

- میرؔ تغزل کے استاد کہلاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو غزل کے لیے ضروری ہیں۔ میرؔ نے بیک وقت عشق و عاشقی کے موضوعات بھی باندھے، خود کو محبوب کا معتوب بھی کہا اور واسوخت کے ذریعے اس کو برا بھلا بھی کہا۔
- غالب کا اصل نام مرزا اسد اللہ خاں تھا، پہلے اسدؔ اور بعد میں غالبؔ تخلص اختیار کیا، 27/دسمبر 1797ء مطابق 8/رجب 1212ھ کو اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔
- غالب کی زندگی تنگ دستی میں گزری۔ ان کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ انہوں نے 1857 کے انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔
- عام طور پر غالب کا تعارف ایک مشکل پسند شاعر کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ لیکن دیوان غالب صرف مشکل اشعار کا کلیات نہیں بلکہ مختلف النوع اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس میں سہل ممتنع بھی ہے اور فارسی تراکیب کا استعمال بھی ہے۔
- غالب نے دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا گوارہ نہ کیا بلکہ اپنی روش آپ بنائی۔ ان کے مزاج میں شوخی اور ظرافت تھی جس کے جابجا ثبوت ان کے خطوط میں مل جاتے ہیں۔
- تصوف کے معاملے میں وہ وحدۃ الوجود کے پیروکار تھے۔ انہیں اپنی متصوفانہ شاعری پر ناز تھا۔

7.5 کلیدی الفاظ

غلبہ	قابو، فوقیت، برتری	Dominance, Supremacy
بیش بہا	قیمتی، انمول	Precious,valuable
اصلاح	درستگی، سنوارنا	Reform, Correction
امکانات	مواقع، گنجائشیں، ممکنہ حالات	Possibilities, Opportunities
یومیہ	روزانہ، روزمرہ	Daily, Per Diem
افاقہ	آرام، صحت میں بہتری	Relief, Recovery
متعدد	کئی، زیادہ	Multiple, Numerous
اشتیاق	تڑپ، شدید خواہش	Desire, Eagerness
وابستہ	جڑا ہوا، متعلق	Associated, Attached
مقیم	رہنے والا، بسنے والا	Resident, Inhabitant
والہانہ	محبّت بھرا، جذباتی	Passionate, Devoted
کثیر الجہات	مختلف پہلوؤں والا	Multidimensional, Multifaceted
تغزل	شاعری کا نرمی و محبت والا انداز	Lyricism, Romantic Expression
لعن طعن	برا بھلا کہنا، ملامت	Cursing, Condemnation

انانیت	خود پسندی، غرور	Egoism, Arrogance
مختلف النوع	مختلف قسم کا	Diverse, Varied

7.6 مشقیں

مشق 1: خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

1۔ میرؔ کا اصل نام __________ تھا۔

2۔ میرؔ __________ میں پیدا ہوئے۔

3۔ نادر شاہ کی جنگ میں __________ کے قتل کے بعد میر کی ملازمت ختم ہو گئی۔

4۔ میرؔ نے __________ تخلص اختیار کیا اور ریختہ گوئی میں کمال حاصل کیا۔

5۔ میرؔ کا انتقال __________ میں ہوا۔

6۔ غالبؔ کا اصل نام __________ تھا۔

7۔ غالبؔ کی پیدائش __________ میں ہوئی۔

8۔ غالبؔ کے والد کا نام __________ تھا۔

9۔ غالبؔ نے __________ کے کلام پر اصلاح دی۔

10۔ غالبؔ کا انتقال __________ میں ہوا۔

مشق 2: صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ میرؔ کے والد کا نام میر محمد علی تھا۔ (   )

2۔ خان آرزو میرؔ کے حقیقی ماموں تھے۔ (   )

3۔ نواب آصف الدولہ نے میرؔ کو لکھنؤ میں دو سو روپے ماہانہ پر رکھا۔ (   )

4۔ میرؔ نے صرف اردو میں شاعری کی اور کوئی فارسی دیوان نہیں لکھا۔ (   )

5۔ میرؔ کی مشہور نثری کتاب 'نکات الشعرا' ہے۔ (   )

6۔ غالبؔ اپنے آپ کو نسلاً ترک کہتے تھے۔ (   )

7۔ غالبؔ نے مولوی معظم اور ملا عبد الصمد سے فارسی پڑھی۔ (   )

8۔ 1857ء کی جنگ کے بعد غالبؔ کی پنشن فوراً بڑھا دی گئی۔ (   )

9۔ رامپور کے نواب نے غالبؔ کو سو روپے ماہوار وظیفہ دیا۔ (   )

10۔ غالبؔ کی شاعری میں تصوف اور فلسفے کی جھلک نہیں ملتی۔ (   )

مشق 3: شعر مکمل کیجیے۔

1۔ جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز ________

2۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب ________

3۔ مت سہل ہمیں جانو، پھرتا ہے فلک برسوں ________

4۔ شعر میرے ہیں سب خواص پسند ________

5۔ دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ________

6۔ ابن مریم ہوا کرے کوئی ________

7۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ________

8۔ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ________

9۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا ________

10۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے ________

مشق 4: سوالات کے جوابات دیجیے۔

1۔ میرؔ کی پیدائش کہاں اور کب ہوئی؟

2۔ خان آرزوؔ سے میرؔ کا کیا رشتہ تھا؟

3۔ میرؔ کو لکھنؤ کس نے اور کس وجہ سے بلایا؟

4۔ میرؔ کی شاعری میں بنیادی جذبات کون سے ہیں؟

5۔ میرؔ کی مشہور نثری کتابوں کے نام لکھیں۔

6۔ غالبؔ کے والد اور چچا کے نام کیا تھے؟

7۔ غالبؔ نے فارسی کس سے سیکھی؟

8۔ 1857ء کی جنگ کے بعد غالبؔ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟

9۔ سہل ممتنع سے کیا مراد ہے؟

10۔ غالبؔ کی شاعری میں کون کون سے موضوعات شامل ہیں؟

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی سوالات:

1۔ میر کا اصلی نام کیا تھا؟

(a) میر متقی (b) محمد تقی (c) میر محمد (d) تقی محمد

2۔ میر کہاں پیدا ہوئے؟

(a)شاہجہان آباد (b)حیدرآباد (c)فرخ آباد (d)اکبر آباد

3۔ میر کس کے بلاوے پر لکھنؤ گئے؟

(a)سراج الدولہ (b)محمد شاہ (c)نواب آصف الدولہ (d)بہادر شاہ

4۔ میر کا انتقال کہاں ہوا؟

(a)لکھنؤ (b)دہلی (c)آگرہ (d)میرٹھ

5۔ ....نے ریختہ کی طرف میرؔ کی توجہ دلائی۔

(a)غالب (b)آصف الدولہ (c)مصحفی (d)سعادت خاں امروہوی

6۔ مرزا غالب کے اجداد کی زبان کیا تھی؟

(a)ہندی (b)فارسی (c)ترکی (d)عربی

7۔ غالب کا مقام پیدائش کیا ہے؟

(a)آگرہ (b)دہلی (c)حیدرآباد (d)رامپور

8۔ غالب کا تخلص پہلے کیا تھا؟

(a)غالب (b)مرزا (c)اسد (d)نوشہ

9۔ غالب کس مغل بادشاہ کے کلام پر اصلاح دیتے تھے؟

(a)اورنگ زیب (b)محمد شاہ (c)بہادر شاہ ظفر (d)اکبر دوم

10۔ غالب نے پنشن کی بحالی کے لیے کس شہر کا سفر کیا؟

(a)کلکتہ (b)رامپور (c)حیدرآباد (d)مدراس

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ میر کے حالات زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ میر کو اردو شاعری کا خدائے سخن کیوں کہا جاتا ہے؟

3۔ غالب کے حالات زندگی کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

4۔ غالب کی شاعری کی خصوصیات لکھیے۔

5۔ میر کے قیام لکھنؤ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ میر تقی میرؔ کے کلام کی شاعرانہ خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان پر ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔

2۔ مرزا غالب کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شاعرانہ خصوصیات واضح کیجیے۔

3۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

موت کا ایک دن معین ہے　　نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد　　پر طبیعت ادھر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی　　موت آتی ہے پر نہیں آتی

7.7.1 کے جوابات:

D	(v)	A	(iv)	C	(iii)	D	(ii)	B	(i)
A	(x)	C	(ix)	C	(viii)	A	(vii)	C	(vi)

اکائی 8: غزل

الطاف حسین حالی، علامہ اقبال

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید
8.1 مقاصد
8.2 الطاف حسین حالی
8.2.1 حالات زندگی
8.2.2 غزل گوئی
8.2.3 غزل
8.2.4 تشریح
8.3 علامہ اقبال
8.3.1 حالات زندگی
8.3.2 غزل گوئی
8.3.3 غزل
8.3.4 تشریح
8.5 اکتسابی نتائج
8.6 مشکل الفاظ
8.7 نمونہ امتحانی سوالات

8.0 تمہید

اردو غزل کے ارتقاء میں حالی اور اقبال دونوں کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ حالی نے غزل کو مقصدی رنگ دے کر اصلاحِ قوم اور اخلاقی بیداری کا ذریعہ بنایا۔ اقبال نے اس روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی غزل میں خودی، بیداریٔ ملت اور انقلابی فکر کو سمو کر اس میں نیا رنگ پیدا کیا۔ حالی کی غزل اصلاحی پیغام سے لبریز ہے جبکہ اقبال کی غزل فلسفیانہ اور حوصلہ افزا مضامین کی آئینہ دار

ہے۔ دونوں شعراء کی کاوشوں نے اردو غزل کو نہ صرف فکری وسعت دی بلکہ عملی رہنمائی کا سرچشمہ بھی بنایا۔ اس اکائی میں ہم ان دونوں شعرا کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال کے حالات زندگی سے واقف ہو سکیں۔
- ان شعرا کی غزل گوئی کا مطالعہ کر سکیں۔
- شامل نصاب غزلوں کی تشریح کر سکیں۔

8.2 الطاف حسین حالی

8.2.1 حالات زندگی:

اردو میں الطاف حسین حالی کی حیثیت کئی اعتبار سے مسلم ہے۔ وہ ایک بہترین نقاد اور سوانح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ شاعر اور ایک درد مند دل رکھنے والے انسان بھی تھے۔ انہیں قوم کی تابناک تاریخ کے زوال کا بڑا درد اور افسوس تھا۔ اسی کو موضوع بنا کر انہوں نے اپنا مشہور مسدس ''مدوجزر اسلام'' لکھا تھا۔ مصلح قوم کے طور پر علی گڑھ تحریک میں ان کی پیش قدمیاں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے مسدس کو سرسید نے اپنے لیے توشہ آخرت بتایا۔ اس سے اردو شاعری میں ان کی غیر معمولی علمی اور فکری گیرائی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حالی کا پورا نام الطاف حسین حالی تھا۔ 1837 کو موجودہ ہریانہ کے شہر پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش اور دادا کا نام خواجہ بو علی بخش تھا۔ حالی کا سلسلہ نسب مشہور صحابی حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ حالی کی عمر صرف نو سال تھی جب ان کے والد کا محض چالیس سال کی عمر میں انتقال ہوا اور اس کے کچھ عرصے کے بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے اٹھائی۔ چونکہ امداد حسین کی کوئی اولاد نہیں تھی اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے کی طرح حالی کی تربیت کی۔

حالی کی تعلیم کا سلسلہ ساڑھے چار سال کی عمر میں شروع ہوا۔ پہلے انہیں ایک مکتب میں داخل کیا گیا جہاں انہوں نے قاری حافظ ممتاز حسین سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کی اور کچھ ہی سالوں میں قرآن کو زبانی یاد بھی کر لیا۔ بعد ازاں پانی پت کے ہی ایک عالم جعفر علی سے انہوں نے فارسی زبان کی تعلیم بھی حاصل کی۔ یہیں سے حالی کے اندر فارسی زبان و ادب سے لگاؤ بھی پیدا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے حاجی ابراہیم حسین سے عربی کی تعلیم بھی پائی۔

ابھی تعلیم کا سلسلہ مکمل بھی نہ ہوا تھا کہ 1853 میں سترہ سال کی عمر میں حالی کے بھائی نے ان کی شادی ان کے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النسا سے کر دی۔ حالی کو ان سے چار لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں جن میں سے دو لڑکے اور ایک لڑکی تو بچپن میں ہی فوت

ہو گئے۔ اس طرح حالی کی اولاد میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں حیات رہے جنہوں نے تعلیم کے میدان میں ایسانام روشن کیا کہ جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ان کے خاندان کے لوگوں نے علم وادب کی بڑی خدمت کی۔ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین کا تعلق حالی کے خاندان سے ہی تھا۔

شادی کے بعد بھی حالی کے اندر علم حاصل کرنے کی پیاس موجود رہی اور انہوں نے دلی جانے کا ارادہ کیا۔ سسرال میں آسودہ حالی تھی اس لیے جب ان کی بیوی اپنے مائکے گئیں تو وہ گھر سے اجازت لیے بغیر ہی دلی چلے گئے اور وہاں حصول تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ دلی کی زندگی حالی کے لیے آسان نہ تھی۔ وہاں ان کی کوئی قیام گاہ نہ تھی اور نہ کوئی جاننے والا تھا۔ دلی کی جامع مسجد کے پاس ایک مدرسہ ''حسین بخش'' تھا، حالی وہاں گئے اور وہیں فرش پر سوتے اور تعلیم حاصل کرتے۔ وہاں ان کے استاد مولوی نوازش علی تھے۔ ان کے ذریعے ہی حالی کو بڑے بڑے علما و شعرا سے ملاقات کرنے کا موقع ملا۔

1855 میں دہلی سے واپس پانی پت آ گئے اور 1856 میں حصار میں ڈپٹی کمشنر کے آفس میں معمولی تنخواہ کے ساتھ نوکری شروع کی، لیکن 1857 کی پہلی جنگ آزادی میں جب حصار انقلاب کی آگ میں جلنے لگا تو حالی پیدل ہی پانی پت کے لیے نکل پڑے۔ اس کے بعد وہ مسلسل چار سال تک پانی پت میں ہی رہے۔ اس دوران انہوں نے ایک طرف منطق، فلسفہ، تفسیر اور حدیث کا علم حاصل کیا اور دوسری طرف اپنے ادبی ذوق کو بھی آب دیتے رہے۔ 1861 میں دوبارہ دہلی کا سفر کیا، جہاں شعر و شاعری کا بازار گرم تھا اور غالب اور ذوق جیسے شاعر دہلی میں شاعری کی شمع کو روشن کیے ہوئے تھے۔ دلی میں حالی تقریباً دو سال تک نوکری کی تلاش میں پھرتے رہے۔ نوکری تو نہ ملی لیکن اسی دوران ان کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی اور وہ آٹھ سال تک بلند شہر میں رہے۔ حالی شیفتہ کے قدردان تھے اور ان کے ادبی ذوق سے بھی بڑے متاثر تھے۔ 1869 میں شیفتہ اور غالب کا انتقال ہوا تو حالی کو بڑا صدمہ پہنچا۔ انہوں نے غالب کا مرثیہ لکھا۔ غالب کی یاد میں ہی حالی نے ان کی سوانح "یادگار غالب" لکھی۔

شیفتہ اور غالب کے انتقال کے بعد حالی کے سامنے پھر سے روزگار کا مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ اس بار حالی نے لاہور کا رُخ کیا اور چار سال تک پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جانے والی کتابوں کی عبارت درست کرنے کی ذمہ داری سنبھالی، جس سے انہیں انگریزی کے تئیں دلچسپی پیدا ہوئی۔ لاہور میں ان کی ملاقات محمد حسین آزاد سے ہوئی اور جب 1874 میں محمد حسین آزاد نے نظم کے مشاعرہ کی ابتداء کی تو حالی بھی اس میں شامل تھے۔ ان مشاعروں کے لیے ہی حالی نے اپنی مثنویاں (برکھارُت، حب وطن، نشاط امید، مناظرہ رحم وانصاف) لکھیں۔

قیام دہلی کے دوران حالی کی ملاقات سرسید سے ہوئی تھی لہٰذا سرسید کی فرمائش پر انہوں نے 'مدوجزر اسلام' لکھی۔ لاہور میں انہوں نے عورتوں کے لیے ایک نثری کتاب ''مجالس النسا'' لکھی جس پر انہیں چار سو روپے کا انعام بھی ملا۔ 1874 میں حالی دوبارہ دلی گئے اور وہاں کے اینگلو عربک اسکول سے تقریباً چودہ سال تک وابستہ رہے۔ سرسید کی سفارش پر نواب آسماں جاہ وزیر اعظم حیدرآباد نے حالی کا 75 روپے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کیا۔ کچھ عرصے بعد حالی دلی چھوڑ کر بیٹے کے گھر چلے گئے اور وہیں مقیم رہے۔ اور 1914 کو پانی پت میں ان کا انتقال ہو گیا۔

8.2.2 غزل گوئی:

حالی نے اردو میں ادبی کتب کا ایک بیش بہا سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ انہوں نثر سے پہلے نظم کہی لیکن تصنیف و تالیف کا کام نثر سے شروع کیا۔ انہوں نے عورتوں کی اصلاح کے لیے 1874 میں 'مجالس النسا' لکھی۔ 1884 میں شیخ سعدی کی مفصل اور مبسوط سوانح عمری 'حیات سعدی' کے عنوان سے لکھی۔ 1893 میں اپنے دیوان کے ساتھ پہلی بار مقدمہ شائع کیا۔ 1897 میں غالب کے مکمل حالات زندگی 'یادگار غالب' کے نام سے لکھے اور کلام پر تبصرہ بھی کیا۔ 1901 میں سر سید کے حالات زندگی پر مفصل اور مشہور زمانہ کتاب 'حیات جاوید' لکھی۔ حالی کی زندگی میں ہی ان کے مضامین کا مجموعہ 'مضامین حالی' کے عنوان سے 1902 میں شائع ہوا۔ قطعات، غزل اور رباعیات کا مجموعہ 1934 میں کلیات نظم حالی کے نام سے شائع ہوا۔ حالیؔ کی مشہور نظموں میں مرثیہ غالب اور مسدس حالی ایسے کارہائے نمایاں ہیں جنہوں نے حالی کو زندہ و جاوید کر دیا ہے۔

غزل سے حالی کی دلچسپی کا اندازہ ان کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' کے اس حصے سے کیا جاسکتا ہے جس میں انہوں نے غزل پر نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن اس کی گردن اڑانے کو کبھی گوارہ نہیں کیا بلکہ اس میں ضروری اصلاح کرکے اسے ہر دل عزیز بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے غزل میں نئے موضوعات اور تجربات کی حوصلہ افزائی اور اصلاحی تجاویز پیش کیں اور غزل کو ایک نئی توانائی اور زندگی عطا کی اور دردِ دل بیان کرنے کا وسیلہ بنا دیا۔ انہوں نے غزل کو نیچرل شاعری کی طرف متوجہ کیا اور قدما کے بنے بنائے راستوں میں نئے موڑ کا اضافہ کیا۔

حالی کا تخلص پہلے خستہؔ تھا لیکن بعد میں شیفتہ کے مشورے پر حالیؔ تخلص اختیار کیا۔ حالی نے جب غزل کی ابتدا کی تو ان کا رنگ سخن روایتی تھا اور عشق و عاشقی کی باتوں کے سوا ان کے یہاں بھی کچھ نہیں تھا لیکن 1875 کے بعد ان کی غزلوں میں جدید رنگ تغزل کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ان کی غزل گوئی کا سلسلہ تقریباً چالیس سال تک چلتا رہا۔ لیکن پہلے بیس سال ہی شاعری کی طرف توجہ دی اور بعد کے بیس سال نثر نویسی، سوانح نگاری اور نقد و نظر میں گزرے۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

حالی نے اپنی غزلوں کا لہجہ نرم اور نازک رکھا۔ طنز میں بھی کبھی زخمِ تیغ کی صورت اختیار نہیں کی۔ کبھی کبھی ان کی آواز اتنی مدھم ہوتی ہے کہ سنائی بھی نہیں پڑتی، لیکن اپنا کام کر جاتی ہے۔

اب بھاگتے ہیں سایہ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

حالی کی غزلوں کی ایک اور خصوصیت اخلاقیات سے دلچسپی ہے۔ اس قسم کے مضامین باندھتے ہوئے وہ قدیم غزل کی پیروی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور ان کے یہاں پند و نصائح اور وعظ و خطابت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

خود بڑا بن کر دکھاؤ آپ کو
باپ داد کی بڑائی ہو چکی

جانور، آدمی، فرشتہ، خدا
آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں

طنز و مزاح بھی حالی کی غزلوں کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔ وہ غالب کے شاگرد تھے تو اس میدان میں ان کا تتبع کیوں کر نہ کرتے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ریاکار زاہدوں اور بے عمل واعظوں پر جابجا طنز کیے ہیں۔ اس کے علاوہ قومی کارکنوں اور خود غرض اشخاص پر استعارے اور کنائے کا سہارا لیتے ہوئے بھرپور طنز کیا ہے۔

مان لیجئے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

حالی نے صنائع لفظی و معنوی، محاوروں، استعاروں، تمثیل کو بھی اہمیت دی ہے۔ انہوں نے غزل مسلسل کو بھی رواج دینے کی کوشش کی۔ وہ چاہتے تھے کہ غزل میں ایک مرکزی خیال کو مربوط صورت میں پیش کیا جائے۔ اس کے علاوہ حالی نے اپنی غزلوں میں معرفت و حقیقت کے ذیل میں عارفانہ مضامین باندھے اور قدیم روایات کا احترام بھی کیا۔ انہوں نے غزل میں انفرادی رنگ تغزل اختیار کیا۔

دل پر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

8.4.2 غزل:

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت   نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل   کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
ہے غم روز جدائی نہ نشاط شب وصل   ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار   اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
دیکھیے شیخ مصور سے کھچے یا نہ کھچے   صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت
واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے   یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
کیا خبر زاہد قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص   اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت
میں بچا تیر حوادث سے نشانہ بن کر   آڑے آئی مری تسلیم سپر کی صورت
شوق میں اس کے مزا درد میں اس کے لذت   ناصحو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا　　راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار　　پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں　　دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

غزل کے مشکل الفاظ کے معنی

صورت	حالت	Condition, Form
پیمانِ وفا	وفاداری کا وعدہ، عہدِ محبت	Promise of loyalty, Vow of love
گلِ تر	تازہ پھول، مراد: نیا یا تر و تازہ حسن	Fresh flower, Symbol of freshness/beauty
نشاطِ شبِ وصل	محبوب سے ملاقات کی رات کی خوشی	Joy of the night of union with beloved
خضر	ایک نبی یا بزرگ ہستی جو راہ بھٹکے مسافروں کو راہ دکھاتے ہیں	A prophet/saintly guide (Khizr)
مصور	تصویر بنانے والا، پینٹر	Painter, Artist
بے عیب بشر	ایسا انسان جس میں کوئی نقص نہ ہو	Perfect human, Faultless person
واعظ	نصیحت کرنے والا	Preacher
آتشِ دوزخ	جہنم کی آگ	Fire of hell
زاہدِ قانع	قناعت پسند پرہیزگار شخص	Pious and content, ascetic
حرص	لالچ، نہ ختم ہونے والی خواہش	Greed, Endless desire
کیسۂ زر	سونے یا دولت کی تھیلی، مراد: دولت	Bag of gold, Wealth
حوادث	حادثات، بُرے اور ناگوار واقعات	Calamities, Accidents
تسلیم	جھک جانا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا	Surrender, Submission
سپر	ڈھال	Shield
شوق	محبت، عشق	Love, Intense desire
لذت	مزہ، خوشی، سرور	Pleasure, Delight
مفر	بھاگنے کی جگہ، چھٹکارا	Escape, Way out
اوسان خطا ہونا	حواس باختہ ہونا، گھبراہٹ کی حالت	Confusion, Loss of senses
خطر	اندیشہ، نقصان کا امکان	Danger, Risk

بھنور	پانی کا گھومتا ہوا تیز چکر، مراد: مشکلات	Whirlpool, Trouble, Entanglement

8.2.4 تشریح:

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

اس شعر میں شاعر نے محبوب سے جدائی کے بعد کا احوال بیان کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب سے میرا محبوب مجھے چھوڑ کر گیا ہے، میرا گھر ویران ہو گیا ہے، اس کی دیواروں سے اداسی جھلکتی ہے اور دروازوں پر انتظار کے سائے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے اپنے گھر یعنی دل کی رونق کا سبب اپنے محبوب کو قرار دیا ہے اور اس کے جانے سے دل کی تباہ حالی بیان کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی عزیز ہستی کے جدا ہونے سے گھر بے رونق معلوم ہوتا ہے۔

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

اس شعر میں شاعر نے تمثیلی انداز اختیار کیا ہے شاعر کہتا ہے کہ بلبل کو پھول سے محبت ہے اور وہ اس سے وفا کا یقین دلا رہا ہے مگر یہ پھول جو آج کھلا ہے اور تر و تازہ ہے کل مرجھا جائے گا اس کا حسن ختم ہو جائے گا۔ تب بلبل اسے پہچان ہی نہیں پائے گا۔ اس شعر میں شاعر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کی حسن فانی ہے آج ہے کل نہیں ہو گا، اس لیے فانی حسن سے دل لگانا عقلمندی نہیں ہے۔

ہے غم روز جدائی نہ نشاط شب وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

شاعر کہتا ہے کہ اس کی زندگی میں نہ جدائی کا غم ہے اور نہ وصل کی خوشی ہے۔ اس کی شام اور صبح ایسی ہے کہ نہ پوری طور پر خوش ہے اور نہ غم زدہ ہے۔ شعر میں جدائی کی مناسبت سے شام اور وصل کی مناسبت سے سحر کا استعمال ہوا ہے۔ زمانہ بدل گیا، شاعر کا دل بجھ گیا۔ اب نہ غم کی پرواہ ہے نہ خوشی کی چاہت۔

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

شاعر نمازیوں کو ہوشیار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی بزرگ کی صورت دیکھ کر اس پر بھروسہ نہ کرو۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ اگر خضر بھی مسجد میں آ جائیں تو نمازیوں کو اپنی جیبوں کی حفاظت کرنا چاہیے۔ کیا پتہ کہ خضر کے بھیس میں کوئی رہزن ہو۔ ایک مطلب یہ بھی ہے کہ مساجد میں اب ایسے بزرگ ہیں جو صورت میں خضر جیسے ہیں لیکن لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، غلط راستے پر لے جاتے ہیں۔

دیکھیے شیخ مصور سے کھچے یا نہ کھچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

اردو شاعری میں شاعر عام طور پر شیخ اور واعظ پر طنز کرتے ہیں۔ حالی نے اس شعر میں غزل کی اسی روایت کو دہرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شیخ جی کی صورت تو ایسی بے عیب ہے کہ مصور بھی اس کی تصویر نہیں کھینچ سکتا۔ انسان کے بنائے ہوئے ہر کام میں کچھ نہ کچھ کمی ضرور رہ جاتی ہے لیکن چونکہ شیخ جی کی صورت میں کوئی عیب ہی نہیں ہے لہذا ان کی تصویر کو بنانا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

اس شعر میں شاعر کہتے ہے کہ واعظوں نے لوگوں کو نیکی کی طرف راغب کرنے کے لیے ان کو ڈرانے کا کام شروع کر رکھا ہے اور ان کے اس ڈرانے سے لوگ ان سے ہی ڈر جاتے ہیں اور دین کو بھی خوف سمجھ لیتے ہیں جبکہ ان کو چاہیے کہ وہ دین محبت سے سیکھائیں اور اللہ کی محبت کے لیے سکھائیں تب ہی ممکن ہے لوگ نیکی کے راستے پر آئیں۔

کیا خبر زاہد قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

قناعت پسند زاہد بالکل نہیں جانتا کہ لالچ اور ہوس کیا چیز ہوتی ہے۔ دولت کا لالچ تو اسے ہوتا ہے جس نے کبھی دولت کی شکل دیکھی ہو۔ چونکہ زاہد کو عبادت سے ہی فرصت نہیں ہوتی اور وہ دنیا سے دور رہتا ہے اس لیے دولت اور پیسے کا لالچ اسے مطلق نہیں ہے۔ یہ بات طنزاً کہی ہے۔ اصل مقصود یہ دکھانا ہے کہ زاہد کو دولت کی بڑی حرص ہے۔

میں بچا تیر حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مری تسلیم سپر کی صورت

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کے میں اپنا ہر فیصلہ اللہ کے حکم کے مطابق اور اس کی رضامندی کے لیے کیا ہے اس لیے میرے سر پر جب بھی کوئی مشکل آچکی ہے اس میں اللہ کا مجھے سہارا ملا ہے۔ شاعر کہتا ہے انسان اگر اپنے اعمال کو اللہ کی رضا کے مطابق کرے تو وہی فرمانبرداری اس کی مشکلات میں ڈھال بن کر سامنے آجاتی ہے۔

شوق میں اس کے مزا درد میں اس کے لذت
ناصحو اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

اے ناصحو! مجھے اپنے محبوب کی آرزو کرنے میں مزا آتا ہے اور اس کے دیے گئے درد میں مجھے لذت ملتی ہے۔ اس لیے اس سے فرار اختیار کرنے اور بھاگنے کی کوئی صورت میرے پاس نہیں ہے۔

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارے رہنما جو ہمارے ساتھ ڈٹے کھڑے تھے۔ پے درپے آنے والے مصائب نے ان کے بھی اوسان خطا کر دیئے ہیں۔ ان کی ہمت اب جواب دے رہی ہے اور کچھ لوگوں نے اپنے نصب العین کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ مصائب سے بھاگنا جواں مردی نہیں ہے۔ خطرے کا مقابلہ کرنا مردانگی ہے۔

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار

پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ قوم پر بہت سے مصائب آتے رہے ہیں مگر اللہ کے کرم سے وہ اس سے نکل ہی آتی تھی ان کی کشتی کبھی منجدھار میں نہیں پھنسی۔ مگر اس بار حالات بہت خراب نظر آتے ہیں اس بار قوم کا بیڑا ایسے گرداب میں پھنستا چلا جارہا ہے، جس سے نکلنے کی کوئی بھی صورت نظر ہی نہیں آتی۔ غالباً 1857ء کے حالات کی طرف اشارہ ہے۔

ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں

دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

اس شعر میں شاعر نے اپنے آپ پر طنز کیا ہے۔ وہ محبوب کو اپنے گھر مدعو کرنا اور اسے مہمان بنانا چاہتا ہے۔ حالانکہ نہ وہ خود محبوب کی میزبانی کے قابل ہے نہ اس کا گھر محبوب کے قیام کے لائق ہے۔

8.3 علامہ اقبال

8.3.1 حالات زندگی :

اقبال کے بزرگ کشمیری سپرو برہمن تھے۔ علامہ کے پَر دادا کا نام شیخ جمال الدین تھا۔ جنہوں نے کشمیر کے ابتر حالات سے مجبور ہو کر وہاں سے ہجرت کی اور سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ اقبال 9/نومبر 1877 مطابق 3 ذی قعدہ 1294 ھجری بروز جمعہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز روایتی طور پر ہوا۔ ابتدائی تعلیم مولانا غلام حسن کے مکتبہ عمر شاہ، محلہ شوالہ، سیالکوٹ کی مسجد میں حاصل کی۔ مولوی میر حسن کی جوہر شناس نظر نے انہیں اپنے پاس بلا کر عربی اور فارسی کے ساتھ قرآن مجید کا درس دیا۔ اقبال بچپن سے ہی بڑے ذہین تھے۔ اگرچہ ان کے والد شیخ محمد بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے لیکن اپنے شوق اور محنت کی وجہ سے بہت سی فارسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے صوفیا کی صحبت میں بہت وقت گزارا۔ قادریہ سلسلے میں بیعت تھے اور سلطان العارفین قاضی سلطان محمود دربار آباں شریف کے مرید تھے۔ اقبال بھی بچپن ہی میں سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہو گئے تھے۔ تلاوت کلام پاک کا شوق بچپن سے تھا اور آواز بھی اچھی پائی تھی۔ فجر کی نماز کے لیے والد کے ساتھ مسجد جاتے تھے اور گھر آکر تلاوت قرآن کرتے۔ ان کے والد نے انہیں نصیحت کی کہ کلام پاک کو اس طرح پڑھو کہ اللہ تعالیٰ تم ہی سے مخاطب ہے اور یہ تم پر ہی نازل ہوا ہے۔ اس نصیحت کا علامہ کو بڑا فائدہ ہوا۔ وہ کلام پاک کے رموز و نکات پر مسلسل غور و فکر کرتے رہے اور قرآن حکیم کی تعلیمات ان کے پورے وجود میں سرایت کر گئیں۔ اقبال کی والدہ کا نام امام بی بی تھا جن سے چھ اولادیں (تین بیٹے اور تین بیٹیاں) ہوئیں۔ علامہ اقبال بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اقبال کی تربیت میں ان کے والد اور استاد کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ ماجدہ کا کردار بڑا اہم ہے۔ انہوں نے اقبال کی تربیت اس انداز میں کی کہ ان کے دل میں ملک و ملت کی خدمت کے لیے ایسا جذبہ پیدا ہوا جو تادم مرگ برقرار رہا۔

مولوی میر حسن کے مشورے پر 1883 میں اقبال کو سیالکوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں داخل کروایا گیا۔ 1888ء میں

پرائمری کا امتحان نمایاں حیثیت کے ساتھ پاس کرنے پر وظیفہ ملا۔ اسی طرح 1891ء میں مڈل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور وظیفہ حاصل کیا۔ 1893 میں میٹرک اور 1895 میں انٹرمیڈیٹ کی تعلیم اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے حاصل کی۔ سیالکوٹ میں ایف اے کے بعد اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہ تھا۔ اس لیے اقبال نے 1895ء میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں بی۔ اے۔ میں داخلہ لیا اور اپنے لیے انگریزی کے علاوہ عربی اور فلسفہ کے مضامین کا انتخاب کیا۔ 1897 میں بی۔ اے کا امتحان خاص امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور فلسفہ کے دو تمغے حاصل کیے۔ بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا اور امتحان میں اول رہے۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی آرنلڈ اور اقبال میں استاد اور شاگرد کے تعلقات نے شخصی روابط کا رنگ اختیار کیا۔

ایم۔ اے کا امتحان دینے کے بعد 13/ مئی 1899 سے اورینٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے تقریباً چار سال یعنی مئی 1903 تک اقبال اورینٹل کالج میں کام کرتے رہے۔ اس دوران جنوری 1901 میں چھ ماہ کے لیے گورنمنٹ کالج میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ اسی سال ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے امتحانی مقابلے میں کامیاب ہوئے مگر میڈیکل میں ان فٹ (Unfit) پائے گئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج میں فلسفہ اور انگریزی کے ایڈیشنل پروفیسر مقرر ہوئے۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے یورپ کا رخ کیا اور ستمبر 1905 کو لاہور سے روانہ ہوئے اور جولائی 1908 کو واپس آئے۔ اقبال نے یہ سفر صرف تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کیا۔ کیمبرج یونیورسٹی سے تحقیقات علمی کے ذریعے "فلسفہ اخلاق" کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد 1907 میں میونخ یونیورسٹی، جرمنی سے "ایران میں فلسفۂ مابعد الطبیعات کا ارتقا" پر ایک کتاب (Development of Metaphysics in Persia) لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی (پی ایچ۔ ڈی) کی فرسٹ کلاس کی ڈگری حاصل کی۔ جو بعد میں لندن سے 1908 میں شائع ہوئی۔ 1963 میں اس کا اردو ترجمہ "فلسفہ عجم" کے نام سے حیدرآباد سے شائع ہوا۔

جرمنی سے واپس آکر اقبال نے لندن میں اسکول آف پولیٹکل سائنس میں داخلہ لیا اور وہاں پر بڑے بڑے سائنس دانوں، پروفیسروں، فضلا، حکما اور مدبرین سے استفادہ کیا اور بیرسٹری کا امتحانی بھی کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ چھ ماہ تک پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عربی کے پروفیسر بھی رہے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد انہوں نے دوبارہ انگلستان کا سفر دوسری گول میز کانفرنس (1931) میں شرکت کی غرض سے کیا۔ انگلستان سے واپسی میں اٹلی کی حکومت کی دعوت پر روم گئے۔ اس کے بعد مصر اور فلسطین گئے۔ 1932 میں تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں پھر یورپ گئے۔ واپس آتے ہوئے ہسپانیہ کی بھی سیر کی۔ نادر شاہ کی دعوت پر 1933 میں سید سلیمان ندوی اور راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا بھی سفر کیا۔ یہ غالباً بیرون ملک ان کا آخری سفر تھا۔ انہوں نے اندرون ملک کے متعدد شہروں کے دورے کیے۔ ان اسفار میں بھوپال، حیدرآباد دکن، ممبئی، دہلی، علی گڑھ، کشمیر اور پانی پت کا نام شامل ہے۔ 10/ جنوری 1934 کو علامہ کی علالت کا آغاز ہوا اور 17/ مارچ 1938 ایسی طبیعت خراب ہوئی کہ پھر سنبھل نہ پائے۔ آخر کار 21/ اپریل 1938 کو انتقال کیا۔

8.3.2 غزل گوئی:

اقبال کو بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ اسکاچ مشن کالج میں تعلیم کے دوران ہی میر حسن کی صحبت کے اثر سے اقبال میں شعر فہمی اور سخن سنجی کی غیر معمولی صلاحیت ابھر کر سامنے آئی۔ پنجاب میں ان دنوں اردو کا رواج تھا اور شہر میں شعر و شاعری کا چرچا عام

تھا۔ اقبال کے طالب علمی کے دنوں میں ہی ایک چھوٹا مشاعرہ ہوتا تھا جس کے لیے اقبال کبھی کبھی غزلیں کہا کرتے تھے۔ ان دنوں شاعری میں مرزا داغ دہلوی کی بڑی شہرت تھی۔ اقبال نے انہیں چند غزلیں اصلاح کے لیے بذریعہ خط بھیجیں۔ انہوں نے داغ کی شاگردی کے اس رشتے کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا ہے:

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردئ داغ سخنداں کا

اقبال کی شعر گوئی کا آغاز تو 1901 سے تقریباً دو سال پہلے ہی لاہور کے چھوٹے چھوٹے مشاعروں سے ہو گیا تھا لیکن اس وقت تک وہ اپنی غزلوں کو محفوظ نہیں رکھتے تھے۔ نور الحسن نقوی نے لکھا ہے کہ وہ میٹرک کے بعد سے ہی غزلیں رسالوں میں بھیجنے لگے تھے۔ اس دور میں ان کی غزلوں کی تعداد 28 قرار دی گئی ہے۔ 1901 سے قبل اقبال کی شاعری کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ ان کی اس زمانے کی غزلوں پر داغ کا اثر دکھائی دیتا ہے۔

3/ ستمبر 1924 کو اقبال کا پہلا مجموعہ ''بانگ درا'' شائع ہوا۔ یہ اقبال کی 1901 سے 1924 تک لکھی گئی شاعری پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ ان کے اردو مجموعوں میں سب سے ضخیم ہے۔ اس مجموعے میں 143 نظمیں اور 28 غزلیں ملتی ہیں۔

زبور عجم فارسی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں 156 اور دوسرے میں 75 غزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ مستزاد نظمیں بھی ہیں۔ یہ مجموعہ 1927 میں منظر عام پر آیا۔

جاوید نامہ فارسی کا شعری مجموعہ ہے جو فروری 1932 میں شائع ہوا۔ یہ اقبال کی فکری پختگی کا بھرپور اظہار خیال ہے۔ اس میں سات آسمانوں کا خیالی سفر منظوم کیا گیا ہے۔ فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک مشتری، فلک زحل اور آس سوئے افلاک جیسے عنوانات کے ساتھ ساتھ طاسین گوتم، طاسین زرتشت، طاسین مسیح اور طاسین محمدؐ جیسے ذیلی عنوانات ہیں۔ یہ اقبال کی فارسی شاعری کا سب سے ضخیم کارنامہ ہے۔

اقبال کی اردو شاعری کا دوسرا مجموعہ '' بال جبریل'' 1935 میں شائع ہوا۔ پہلے اقبال نے اس کا نام ''نشانِ منزل'' رکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن بعد میں اسے تبدیل کر دیا۔ اس میں ''بانگ درا'' کے بعد دس سال کے شعری سفر کا سرمایہ موجود ہے۔ یہ غزلوں، نظموں اور رباعیوں کا مجموعہ ہے جس میں غزلوں کی تعداد 77 ہے۔ ضرب کلیم 1936 میں منظر عام پر آیا۔ یہ اقبال کا تیسرا شعری مجموعہ ہے۔ اس میں زیادہ تر مختصر نظمیں ہیں۔

یوں تو علامہ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے لیکن ان کی غزل گوئی بھی اردو ادب میں ایک منفرد اور بلند مقام رکھتی ہے۔ اقبال نے غزل کو محض عشقیہ جذبات اور روایتی انداز تک محدود رکھنے کے بجائے اسے فکر و فلسفہ، ملی شعور اور انقلابی پیغام کا ذریعہ بنایا۔ ان کے ابتدائی دور کی غزلوں میں کلاسیکی رنگ جھلکتا ہے جس میں حسن و عشق، ہجر و وصال اور رومانوی کیفیتیں ملتی ہیں، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی غزل گوئی میں معنوی گہرائی اور فکری وسعت پیدا ہوئی۔ اقبال کی غزلوں کی پہلی نمایاں خصوصیت فلسفۂ خودی ہے۔ وہ فرد کو اپنی اصل پہچان اور قوت پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

اس طرح کے اشعار غزل کو محض جمالیاتی صنف سے بلند کر کے عملی زندگی کا منشور بنا دیتے ہیں۔ دوسری اہم خصوصیت عشق کا تصور ہے جو اقبال کے ہاں صرف دنیاوی نہیں بلکہ روحانی ہے۔ ان کے نزدیک عشق وہ قوت ہے جو انسان کو بلند مقامات تک پہنچاتی ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں

یہاں عشق کو ارتقا اور جستجو کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ اقبال کی غزل گوئی کی تیسری نمایاں خصوصیت قومی بیداری اور حریت ہے۔ اقبال نے اپنی غزلوں کے ذریعے غلامی کے خلاف آواز بلند کی اور نوجوانوں میں جوش وولولہ پیدا کیا:

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس شعر میں یقین اور ایمان کو آزادی کی اصل قوت قرار دیا گیا ہے۔ چوتھی خصوصیت اسلامی وحدت اور ملی شعور ہے۔ اقبال نے ملت اسلامیہ کو اپنے روشن ماضی کی یاد دلا کر مستقبل کی تعمیر کا پیغام دیا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہ شعر واضح کرتا ہے کہ اقبال کی غزل کا مقصد محض دل لگی نہیں بلکہ ایک عظیم امت کی تعمیر ہے۔ پانچویں خصوصیت علامتوں اور استعاروں کا نیا استعمال ہے۔ شمع و پروانہ، بلبل و گل، صحرا و کوہ، شاہین اور زنجیر جیسے روایتی الفاظ کو انہوں نے تازہ اور انقلابی معنویت دی۔ شاہین ان کی غزل میں بلند ہمتی، آزادی اور خود اعتمادی کی علامت ہے۔

یوں اقبال کی غزلوں میں فلسفہ، عشق، خودی، حریت، ملی شعور اور روحانی ارتقا سب یکجا ہو جاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں موسیقیت، روانی اور اثر انگیزی ایسی ہے جو دل کو مسحور اور دماغ کو بیدار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی غزل محض ایک ادبی صنف نہیں بلکہ ایک فکری و انقلابی تحریک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ ان کی غزلیں آج بھی نوجوانوں کو حوصلہ، عمل اور خود اعتمادی کا پیغام دیتی ہیں اور ملت اسلامیہ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

8.3.3 غزل:

تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر	مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر
جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے	حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر
گرچہ ہے دل کشا بہت حسن فرنگ کی بہار	طائرک بلند بام دانہ و دام سے گزر
کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب	تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر
تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور	ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

غزل کے مشکل الفاظ کے معنی:

رہ گزر	راستہ	Path, passage
قید مقام	کسی جگہ ٹھہر جانا، محدود ہونا	Restriction of place, stagnation
مصر و حجاز	مصر اور حجاز (اسلامی دنیا کے مشہور علاقے)	Egypt and Hejaz (regions of Islamic world)
پارس و شام	ایران اور شام	Persia and Syria
عملِ بے غرض	ایسا عمل جو کسی لالچ یا فائدے کے بغیر ہو	Selfless deed
جزا	بدلہ، انعام	Reward, recompense
خیام	خیمے	Tents, pavilions
بادہ و جام	شراب اور پیالہ	Wine and goblet
دل کشا	دل کو خوش کرنے والا، دل فریب	Pleasing, delightful
طائرک بلند بام	اونچی چھت پر بیٹھنے والا پرندہ، مراد: بلند حوصلہ شخص	High-flying bird
دانہ و دام	دانہ اور جال، مراد: لالچ اور دھوکہ	Grain and snare (symbol of greed and trap)
کوہ شگاف	پہاڑ کو چیر دینے والا	Mountain-splitting
کشاد	کھلنا، وسعت ملنا	Opening, expansion
تیغ ہلال	چاند کی مانند تلوار، مراد: اسلام کی قوت	Crescent-shaped sword
نیام	تلوار رکھنے کا غلاف	Scabbard, sheath
امام بے حضور	ایسا امام جس کا دل نماز میں اللہ کی حضوری کے احساس سے خالی ہو	An inattentive leader in prayer
نمازِ بے سرور	ایسی نماز جس میں روحانیت نہ ہو	Prayer without devotion

8.3.4 تشریح

یہ غزل علامہ اقبال کے شعری مجموعہ بال جبریل سے اخذ کی گئی ہے جس کا مطلع یہ ہے

تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر

اس شعر میں اقبال اپنے قاری کو عمل اور جستجو کی مسلسل راہ دکھاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان ابھی سفر کے ابتدائی مرحلے میں ہے، اس لیے کسی مقام یا منزل پر رک جانا مناسب نہیں۔ صرف مصر، حجاز، ایران یا شام کی سرزمینیں ہی منزل نہیں بلکہ اس سے آگے

اور بھی دنیائیں ہیں۔ اقبال یہاں قیدِ مقام سے مراد جمود اور محدودیت لیتے ہیں اور پیغام دیتے ہیں کہ انسان کو اپنی روحانی و فکری پرواز کو زمین کے جغرافیائی دائرے سے بلند کرنا چاہیے۔

جس کا عمل ہے بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر بادہ و جام سے گزر

اقبال عمل کے مقصد کو واضح کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جس بندے کا عمل خالص اور بے غرض ہو، یعنی وہ محض خدا کی رضا کے لیے ہو، اس کا صلہ عام جنت کی نعمتیں نہیں بلکہ کچھ اور ہے جو نہایت عظیم ہے۔ وہ قاری کو نصیحت کرتے ہیں کہ حور و قصور اور شراب و جام جیسی لذتوں سے آگے بڑھ کر اللہ کی قربت کو مقصد بنائے۔ اس شعر میں روحانی ارتقا اور اخلاصِ نیت کا درس ہے۔

گرچہ ہے دل کشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بام دانہ و دام سے گزر

اس شعر میں اقبال مغربی تہذیب کے ظاہری حسن اور کشش کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اپنے قاری کو خبردار کرتے ہیں کہ یہ سب صرف دکھاوا اور فریب ہے۔ وہ نوجوان کو طائرِ بلند بام (بلندیوں پر اڑنے والا پرندہ) سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ اگر تم واقعی بلند پرواز ہو تو دانہ و دام جیسے فریب سے بچو۔ یہاں دانہ و دام استعاراتی طور پر مغربی مادیت اور عیش و عشرت کی علامت ہیں۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان نوجوان کو اپنی شناخت اور مقصدِ حیات کو مغربی چمک دمک پر قربان نہیں کرنا چاہیے۔

کوہ شگاف تیری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب
تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

یہ شعر نوجوانوں کے جوش و ولولے کو ابھارتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ تمہاری ضرب اتنی طاقتور ہے کہ پہاڑوں کو چیر سکتی ہے اور مشرق و مغرب کے دروازے تمہارے لیے کھل سکتے ہیں۔ مگر یہ تب ممکن ہے جب تم تلوار کی طرح نیام سے نکل کر حرکت اور عمل میں آؤ۔ اگر تم نیام میں ہی سوئے رہو گے تو بیکار ہو جاؤ گے۔ "تیغ ہلال" یہاں مسلمان کی قوت اور ایمانی طاقت کی علامت ہے جبکہ "عیش نیام" آرام پرستی اور بے عملی کو ظاہر کرتا ہے۔

تیرا امام بے حضور تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر ایسے امام سے گزر

یہ آخری شعر اسلامی معاشرت کے ایک بڑے مرض پر تنقید ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر تمہارا امام خشوع و خضوع سے محروم ہے اور تمہاری نماز بھی بے روح اور رسمی بن چکی ہے تو ایسی عبادت کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ نصیحت کرتے ہیں کہ ایسی کھوکھلی رسومات سے آگے بڑھو اور دین کو اس کی اصل روح کے ساتھ اپناؤ۔ اس شعر میں رسمی عبادات پر گہری تنقید اور حقیقی روحانیت کی تاکید ملتی ہے۔

8.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- حالی کا پورا نام الطاف حسین حالی تھا۔ 1837 کو ہریانہ کے پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ ایزد بخش اور دادا کا نام خواجہ بو علی بخش تھا۔ حالی کا سلسلہ نسب مشہور صحابی حضرت ایوب انصاری سے ملتا ہے۔
- سترہ سال کی عمر میں حالی کے بھائی نے ان کی شادی ان کے ماموں میر باقر علی کی بیٹی اسلام النسا سے کر دی۔ ان کے خاندان کے لوگوں نے علم و ادب کی بڑی خدمت کی۔ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین کا تعلق حالی کے خاندان سے ہی تھا۔
- شادی کے کچھ دن بعد حالی نے دہلی کا رُخ کیا لیکن ملازمت نہ ملنے پر 1855 میں دہلی سے واپس پانی پت آ گئے اور 1856 میں حصار میں ڈپٹی کمشنر کے آفس میں معمولی تنخواہ کے ساتھ نوکری شروع کی، جو 1857 کے انقلاب کی نذر ہو گئی۔
- 1861 میں دوبارہ دہلی کا سفر کیا، جہاں شعر و شاعری کا بازار گرم تھا اور غالب اور ذوق جیسے شاعر دہلی میں شاعری کی شمع کو روشن کیے ہوئے تھے۔ حالی نے شیفتہ اور غالب کی شاگردی اختیار کی اور ان کے انتقال تک ان کے ساتھ رہے۔
- غالب کے انتقال نے حالی کو بڑا صدمہ پہنچایا اور انہوں نے 'مرثیہ غالب' لکھا۔ بعد میں غالب کی سوانح 'یادگار غالب' کے عنوان سے لکھی۔
- قیام دہلی کے دوران حالی کی ملاقات سرسید سے ہوئی تھی لہٰذا سرسید کی فرمائش پر انہوں نے 'مد و جزر اسلام' لکھی۔ لاہور میں انہوں نے عورتوں کے لیے ایک نثری کتاب "مجالس النسا" لکھی جس پر انہیں چار سو روپے کا انعام بھی ملا۔
- 1914 کو پانی پت میں ان کا انتقال ہو گیا۔
- غزل سے حالی کی دلچسپی کا اندازہ ان کی کتاب 'مقدمہ شعر و شاعری' کے اس حصے سے کیا جا سکتا ہے جس میں انہوں نے غزل پر نکتہ چینی کی ہے۔
- حالی نے اپنی غزلوں کا لہجہ نرم اور نازک رکھا۔ حالی کی غزلوں کی ایک خصوصیت اخلاقیات سے دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح بھی حالی کی غزلوں کی اہم خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اس کے علاوہ حالی نے اپنی غزلوں میں معرفت و حقیقت کے ذیل میں عارفانہ مضامین باندھے اور قدیم روایات کا احترام بھی کیا۔ انہوں نے غزل میں انفرادی رنگ تغزل اختیار کیا۔
- اقبال 9/ نومبر 1877 مطابق 3 ذی قعدہ 1294 ھجری بروز جمعہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔
- اقبال کی والدہ کا نام امام بی بی تھا جن سے چھ اولادیں (تین بیٹے اور تین بیٹیاں) ہوئیں۔ علامہ اقبال بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔
- مولوی میر حسن کے مشورے پر 1883 میں اقبال کو سیالکوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں داخل کروایا گیا۔ 1888ء میں پرائمری اور 1891ء میں مڈل کا امتحان کا امتحان پاس کیا۔ 1893 میں میٹرک اور 1895 میں انٹر میڈیٹ کی تعلیم اسکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں ہی پائی۔ 1897 میں بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے (فلسفہ) میں داخلہ لیا۔
- اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے یورپ کا رخ کیا اور ستمبر 1905 کو لاہور سے روانہ ہوئے اور جولائی 1908 کو واپس آئے۔
- آخر کار 21/ اپریل 1938 کو انتقال کیا۔

- 3/ ستمبر 1924 کو اقبال کا پہلا مجموعہ "بانگ درا" شائع ہوا۔ اقبال کی اردو شاعری کا دوسرا مجموعہ "بال جبریل" 1935 میں شائع ہوا۔
- زبور عجم فارسی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جاوید نامہ فارسی کا شعری مجموعہ ہے جو فروری1932 میں شائع ہوا۔ زبور عجم فارسی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ جاوید نامہ فارسی کا شعری مجموعہ ہے جو فروری1932 میں شائع ہوا۔
- یوں تو علامہ اقبال کی شاعری کا بڑا حصہ نظموں پر مشتمل ہے لیکن ان کی غزل گوئی بھی اردو ادب میں ایک منفرد اور بلند مقام رکھتی ہے۔

8.6 مشکل الفاظ

غلبہ	برتری	Dominance / Supremacy
بیش بہا	قیمتی	Precious / Valuable
امکانات	ممکنہ حالات	Possibilities / Opportunities
وسعت	پھیلاؤ	Expansion / Vastness
یومیہ	روزانہ	Daily
حساس طبع	نازک مزاج	Sensitive Nature
افاقہ	صحت میں بہتری	Recovery / Improvement in health
متعدد	کئی، بہت سے	Numerous / Multiple
اشتیاق	شدید خواہش	Eagerness / Strong Desire
وابستہ	جڑا ہوا	Associated / Connected
مقیم	رہنے والا	Resident / Inhabitant
والہانہ	محبت بھرا	Passionate / Affectionate
کثیر الجہات	کئی پہلو رکھنے والا	Multi-dimensional
تغزل	غزل کا انداز	Style of Ghazal / Lyricism
انانیت	خود پسندی	Egoism / Arrogance
مختلف النوع	مختلف قسموں کا	Diverse / Varied
پیش قدمیاں	پہل کرنا، آگے بڑھنا	Initiatives / Advances
توشہ آخرت	آخرت کے لیے ذخیرہ	Provision for the Hereafter

آسودہ حالی	خوشحالی	Prosperity / Well-being
فرمائش	درخواست	Request / Plea
مدوجزر	اتار چڑھاؤ	Tides / Ups and Downs
مبسوط	پھیلاؤ والا	Extensive / Expansive
تمثیل	مثال دینا	Parable / Example
ابتر حالات	خراب اور بگڑے ہوئے حالات	Adverse/chaotic conditions
جوہر شناس	باصلاحیت پہچاننے والا	Talent recognizer
مغروق	ڈوبا ہوا، مشغول	Deeply engrossed, immersed
رموز و نکات	باریکیاں، پوشیدہ معنی	Subtleties, fine points
تادمِ مرگ	مرنے تک، زندگی بھر	Until death
مدبرین	سوچنے والے بڑے رہنما	Thinkers, statesmen
منشور	اصول و ہدایات	Manifesto
حریت	آزادی	Freedom
وحدت	اتحاد	Unity
استعارہ	تشبیہ، مجازی معنی	Metaphor
مسحور	حیران، متاثر	Fascinated, enchanted
مشعلِ راہ	رہنمائی کرنے والی چیز	Guiding light

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

8.7.1 معروضی سوالات:

1۔ حالی کی مشہور مثنویاں کس مشاعرے کے لیے کہی گئیں؟

(a) دلی کا مشاعرہ (b) علی گڑھ تحریک کے مشاعرے

(c) انجمن پنجاب کے مشاعرے (d) ترقی پسند تحریک کے مشاعرے

2۔ حالی کے استاد کون تھے جن سے انہیں بڑے علما و شعرا سے ملاقات کا موقع ملا؟

(a) مولوی نوازش علی (b) مولوی جعفر علی (c) حافظ ممتاز حسین (d) حاجی ابراہیم حسین

3۔ حالی نے عورتوں کی اصلاح کے لیے کون سی کتاب لکھی؟

(a) مجالس النسواں (b) خواتین کی تعلیم (c) مجالس النسا (d) اصلاح النسواں

4۔ حالی کا تخلص پہلے کیا تھا؟

(a)خستہؔ (b)حالیؔ (c)عاجزؔ (d)حزیںؔ

5۔ حیات سعدی کا مصنف کون ہے؟

(a)غالب (b)سعدی (c)اقبال (d)حالی

6۔ حالی کی محمد حسین آزاد سے پہلی ملاقات کہاں ہوئی؟

(a)دہلی (b)لاہور (c)پانی پت (d)حیدرآباد

7۔ سیالکوٹ میں آباد ہونے سے پہلے علامہ اقبال کے بزرگ ہندوستان کے کس خطے میں آباد تھے؟

(a)آگرہ (b)دہلی (c)حیدرآباد (d)کشمیر

8۔ انگلستان سے واپسی کے بعد کس حکومت کی دعوت پر اقبال روم گئے؟

(a)اٹلی (b)جاپان (c)چین (d)یونان

9۔ اقبال نے اپنے شعری مجموعے بال جبریل کا نام ابتداء میں کیا سوچا تھا؟

(a)نشان راہ (b)مشعل راہ (c) اقبال منزل (d)نشان منزل

10۔ بانگ درا میں غزلوں کی کل تعداد کتنی ہے؟

(a)22 (b)28 (c)34 (d)46

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ حالی نے اپنی غزلوں کو کس نئے رنگ سے متعارف کرایا؟

2۔ حالی کی ابتدائی تعلیم پر مختصر نوٹ لکھیے۔

3۔ حالی کی غزل گوئی کا جائزہ لیجیے۔

4۔ علامہ اقبال نے غزل میں کس طرح کے موضوعات پیش کیے؟

5۔ اقبال کی تعلیمی سرگرمیوں پر اظہار خیال کیجیے۔

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے غزل گوئی کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

2۔ ذیل میں دیے گئے الطاف حسین حالی کے اشعار کی تشریح کیجیے۔

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
کیا خبر زاہد قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

3۔ ذیل میں دیے گئے علامہ اقبال کے اشعار کی تشریح کیجیے:

تو ابھی رہ گزر میں ہے قید مقام سے گزر
مصر و حجاز سے گزر پارس و شام سے گزر
گرچہ ہے دل کشا بہت حسن فرنگ کی بہار
طائرک بلند بام دانہ و دام سے گزر

8.7.1 کے جوابات:

D	(v)	A	(iv)	C	(iii)	A	(ii)	C	(i)
B	(x)	D	(ix)	A	(viii)	D	(vii)	B	(vi)

بلاک III

اکائی 9 : غزل

حسرتؔ موہانی، جگرؔ مرادآبادی

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 حسرت موہانی

9.2.1 تعارف اور غزل گوئی

9.2.2 غزل اور تشریح

9.3 جگر مرادآبادی

9.3.1 تعارف اور غزل گوئی

9.3.2 غزل اور تشریح

9.4 مشقیں

9.5 مشکل الفاظ

9.6 کلیدی الفاظ

9.7 نمونہ امتحانی سوالات

9.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے الطاف حسین حالی اور علامہ اقبال کی غزلوں کا مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں آپ حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔

اردو غزل اپنی ابتدا سے ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ اس کے لب و لہجہ اور انداز و اسلوب میں بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوئیں لیکن اس کی مقبولیت میں کبھی بھی کمی نہیں آئی۔ اگر ہم غزل کو قدیم دور سے الگ کر کے دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر میں اس کے انداز، موضوع اور اسلوب میں تنوع پیدا ہوا ہے جسے جدید غزل کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس دور کے شاعروں میں حسرت اور جگر کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- حسرت اور جگر کے حالات زندگی بیان کر سکیں۔
- حسرت کی شاعری پر اظہار خیال کر سکیں۔
- جگر کی شاعری کی خصوصیات بیان کر سکیں۔
- حسرت اور جگر کی شامل نصاب غزلوں کی تشریح کر سکیں۔

9.2 حسرت موہانی

9.2.1 تعارف اور غزل گوئی:

حسرت موہانی کا پورا نام سید فضل الحسن اور تخلص حسرت تھا۔ 1881ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا غلام علی موہانی سے گھر پر ہی حاصل کی۔ اس کے بعد موہان مڈل اسکول میں داخل ہوئے۔ مڈل کا امتحان پاس کیا اور پورے صوبے میں اول آئے۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور میں داخلہ لیا۔ 1903ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کیا۔ جہاں مولانا شوکت علی اور سید سجاد حیدر یلدرم جیسی شخصیات ان کی ہم جماعت تھیں۔ صاحبزادہ آفتاب احمد اور ڈاکٹر ضیاءالدین جیسے اساتذہ کی سرپرستی میں ان کی شخصیت نکھرتی چلی گئی۔ ابتدا سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ کم عمری سے ہی شاعری کرنے لگے اور تسنیم لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔

حسرت کی شخصیت ہمہ جہت تھی اور وہ مختلف خوبیوں اور صلاحیتوں کے حامل تھے۔ ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ایک عمدہ صحافی، خطیب اور کامیاب سیاست داں بھی تھے۔ انہوں نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1903ء میں انہوں نے ایک رسالہ 'اردوئے معلیٰ' کے نام سے جاری کیا۔ اپنی شاعری اور اپنی صحافتی سرگرمیوں کے ذریعے بھی انہوں نے آزادی کی لڑائی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 1907ء میں انگریزی حکومت کے خلاف لکھنے کے جرم میں پہلی دفعہ جیل بھیج دیے گئے۔ اس کے بعد کئی بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔

حسرت موہانی کو ادب اور شاعری کے علاوہ سیاست سے گہری دلچسپی تھی۔ وہ آل انڈیا کانگریس کے اہم رکن تھے اور انہوں نے گاندھی جی اور دیگر رہنماؤں کے ساتھ مل کر ہندوستان کی جدوجہد و آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1930ء میں حسرت نے ہی سب سے پہلے کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کا ریزولیوشن پیش کیا تھا۔ 13 مئی 1951ء کو حسرت موہانی کا لکھنؤ میں انتقال ہوا۔

حسرت کی غزلوں میں قدیم اور جدید دونوں رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔ ان کی غزلوں کا خاص موضوع حسن و عشق ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری ہی ان کو اردو غزل میں ایک خاص مقام عطا کرتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری کا میدان محدود بھی نظر آتا ہے۔ حالانکہ انہوں نے سیاسی شاعری بھی کی ہے اور آزادی، ظلم و انصاف، مساوات جیسے موضوعات بھی پیش کیے ہیں، مگر ان کی غزلوں کا اہم موضوع حسن و عشق ہی ہے۔

حسرت کی غزلوں میں حسن و عشق پر مبنی جذبات کا اظہار ہوا ہے لیکن ان کا لہجہ، طرز اور انداز بیان ان کی غزلوں کو منفرد اور

خاص بنا دیتا ہے۔ ان کا انداز بیان انوکھا اور انتہائی پر کشش ہے جو ان کی غزلوں کو دوسرے شاعروں سے مختلف اور غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ ان کے یہاں ایک الگ طرح کی شوخی ہے، محبوب سے داخلی چھیڑ چھاڑ، اشاروں کنایوں میں گفتگو کی ایک نرالی طرز ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشق کے فلسفے کو بڑی گہرائی سے سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ایک ایسا اثر اور لطف ہے جو پڑھنے اور سننے والوں کو راحت دیتا ہے۔ حسرت کی شاعری کی زبان اور انداز بیان میں لطافت ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل ہے۔ حسرت کی غزلوں کو پڑھنے میں ایک خاص طرح کا لطف آتا ہے اور سن کر ایک وجد اور مستی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

حسرت کی غزلوں کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں تسلسل نظر آتا ہے۔ اشعار اک دوسرے سے مربوط لگتے ہیں۔ بعض غزلوں میں اس قدر تسلسل اور ربط ہے کہ ان پر نظم کا گمان ہوتا ہے۔ مثلاً ان کی شامل نصاب غزل (ع۔ چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے) کو پڑھ کر ایک مسلسل طویل نظم کا گمان ہوتا ہے۔ حسرت نے اپنی شاعری میں معاملہ بندی سے بہت کام لیا ہے۔ قدیم شاعر معاملہ بندی سے بہت زیادہ کام لیتے تھے۔

حسرت کا لب ولہجہ سادہ اور فطری ہے۔ وہ تصنع اور مشکل پسندی سے کام نہیں لیتے۔ انداز بیان اور زبان کے انتخاب میں سہل پسندی اختیار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ حسرت کی شاعری کا موضوع وہ انسانی جذبات ہیں جو اس کی فطرت سے وابستہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اپنے محدود دائرے کے باوجود بہت مقبولیت اور اثر رکھتی ہے۔

9.2.2 غزل اور تشریح

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل کا دل لگانا یاد ہے

بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

جان کر سوتا تجھے وہ قصد پا بوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہ لحاظ
حال دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانہ یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکر فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبت راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے

میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی	ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے
دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے	جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے
چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ	مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانہ یاد ہے
شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا	اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے
باوجودِ ادعائے اتقا حسرتؔ مجھے	آج تک عہد ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

تشریح:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یا د ہے

اس شعر میں شاعر اپنے دور عاشقی کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب میں عاشقی کے دور کو یاد کرتا ہوں تو وہ دن یاد آجاتے ہیں جب میں اپنے محبوب کی یاد میں دن رات تڑپتا تھا اور چھپ چھپ کر روتا تھا۔ تاکہ دوسروں کو اس کے عشق کا پتہ نہ چلے۔ وہ دن اب تک بھول نہیں سکا اور اب بھی بے چین ہو جاتا ہوں۔

باہزاراں اضطراب و صد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل کا دل لگانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب مجھے آج تک یاد ہے جب تجھ سے پہلے پہل دل لگایا تھا تو پتہ نہیں تم نے ایسا کیا کیا اور تمہاری کون سی ادائیں مجھے بھا گئیں کی میں مضطرب ہو گیا۔ ہزاروں آرزوئیں اور لاکھوں تمنائیں انگڑائیاں لینے لگیں۔ باہزاراں یعنی ہزاروں طرح کے اضطراب اور صد ہزاراں یعنی لاکھوں اشتیاق سے پہلا عشق کیا۔

بار بار اٹھنا اسی جانب نگاہ شوق کا
اور ترا غرفے سے وہ آنکھیں لڑانا یاد ہے

شاعر عاشقی کی زمانے کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میری نگاہ شوق تمہارے دیدار کے اشتیاق میں بار بار کھڑکی کی جانب اٹھتی تھی اور تم بھی کھڑکی سے مجھ سے نگاہیں لڑا لیا کرتے تھے۔ اس طرح ہمارا ایک دوسرے کو دیکھنا اور باتیں کرنا یاد آتا ہے۔

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب مجھے یاد ہے جب ہم تم ملتے تھے تو میری نظر التفات کی بے تکلفی اور میری بے باکی کی وجہ سے تم شرما کر دانتوں تلے انگلی دبا لیتے تھے۔

کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتا
اور دوپٹے سے ترا وہ منہ چھپانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تمہاری ادائیں کس قدر دلربا تھیں جب تم پردے میں بیٹھے ہوتے تھے اور تمہیں دیکھنے کے لیے میں اچانک پردے کونا کھینچ لیتا تھا تو مجھے دیکھ کر تم شرما جاتے تھے اور اور دوپٹے سے اپنا منہ چھپا لیتے تھے۔

جان کر سوتا تجھے وہ قصد پا بوسی مرا
اور ترا ٹھکرا کے سر وہ مسکرانا یاد ہے

شاعر محبوب کی اداؤں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میری خواہش تھی کہ میں تمہارے قدموں کا بوسہ لوں۔ میں تمہیں سوتا جان کر جیسے ہی بوسہ لینے کی کوشش کی تو تم نے پیر سے میرے سر کو ٹھوکر مار کر ٹھکرا دیا اور مسکرانے لگے۔ مجھے تمہاری وہ ادا آج تک یاد ہے۔

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہ لحاظ
حال دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب میں تمہارے عشق میں سرگرداں پھرتا تھا اور جب تم کبھی تنہا مل جاتے تھے تو ادب و احترام کی وجہ سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ پاتا تھا اور اپنے دل کی بات باتوں باتوں میں جتانے کی کوشش کرتا تھا۔

جب سوا میرے تمہارا کوئی دیوانہ نہ تھا
سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانہ یاد ہے

شاعر کہتا ہے ایک وقت تھا جب میرے سوا تمہارا کوئی دیوانہ نہیں تھا۔ تمہارے اندر بھی سادگی تھی۔ بعد میں بہت سے بناوٹی عاشق سامنے آگئے' جس کے سبب محبوب کے اندر خود پسندی اور غرور آگیا۔ مجھے آج بھی وہ پہلے والا دور یاد آتا ہے جب صرف میں تمہارا عاشق تھا۔ کیا تمہیں بھی وہ دور یاد ہے؟ کارخانہ سے حالات مراد ہے۔

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

شاعر محبوب سے کہتا ہے کیا تمہیں وہ زمانہ یاد ہے جب سب کی مرضی کے خلاف لوگوں کی نظروں سے بچ کر تم چوری چھپے راتوں کو مجھ سے ملنے آجاتے تھے۔یعنی عشق یک طرفہ نہیں دو طرفہ تھا۔ محبوب بھی عاشق سے ملنے کے لیے بے چین رہتا تھا۔

آگیا گر وصل کی شب بھی کہیں ذکر فراق
وہ ترا رو رو کے مجھ کو بھی رلانا یاد ہے

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ مجھے آج بھی یاد ہے جب ہم چھپ چھپ کر ملتے تھے اور گفتگو میں اگر جدائی کا ذکر بھی آجاتا تھا تو تم رو رو کر اپنا برا حال کر لیتے تھے اور مجھے بھی رلا دیتے تھے۔ اس طرح وصل کی رات بھی رونے رلانے میں گزر جاتی تھی۔

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ گرما کے موسم میں مَیں بالاخانے میں ہوتا اور محبوب اسے بلانے کے لیے دوپہر کی تپتی دھوپ میں ننگے پاؤں

بالا خانے کی سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچتا۔ اس کے پیر جلتے لیکن وہ اس کی پرواہ نہ کرتا تھا۔

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبت راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے تیرا بلانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب وہ ہماری راز و نیاز کی صحبت آج تک نظروں میں ہے کہ تم کس طرح مجھے بلاتے تھے اور میں کس طرح تم سے ملنے چلا آتا تھا اور پھر ہم راز و نیاز کی باتوں میں کھوئے رہتے تھے۔

میٹھی میٹھی چھیڑ کر باتیں نرالی پیار کی
ذکر دشمن کا وہ باتوں میں اڑانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب تمہاری یہ بھی ایک ادا تھی کہ مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرتے کرتے درمیان میں کسی رقیب اور غیر کا ذکر آتا تو اسے باتوں میں اُڑا دیتے تھے۔ یعنی غیر کا ذکر بھی تمہیں پسند نہیں تھا۔

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ مجھے اب تک یاد ہے کہ کس طرح مجھے ناراض دیکھ کر مجھے منا لیتے تھے لیکن جب میں مان جاتا تھا تو خود روٹھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ تمہاری ادا بھی نرالی تھی۔ یہ ساری باتیں مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔

چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانہ یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ مدتیں گزر چکی ہیں لیکن وہ جگہ جہاں ہم لوگوں کی نظروں سے بچ کر ملتے تھے وہ جگہ ابھی بھی یاد ہے۔

شوق میں مہندی کے وہ بے دست و پا ہونا ترا
اور مرا وہ چھیڑنا وہ گدگدانا یاد ہے

شاعر کہتا ہے کہ تمہیں مہندی کا شوق تھا اور تم مہندی لگا کر سوکھنے کے انتظار میں بیٹھے ہوتے تھے تو پھر میں تمہیں چھیڑتا تھا اور تھا اور تم کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ شاعر نے بے دست و پا اس لیے کہا ہے کہ مہندی لگانے کے بعد ہاتھ پیر چلا نہیں سکتے۔ ہاتھ پیر نہ چلا پانے کی وجہ سے محبوب کو بے دست و پا ہونا کہا ہے۔

باوجود ادعائے اتقا حسرت مجھے
آج تک عہد ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

شاعر عہد شباب یاد کرتے ہوئے اور اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ شباب کا زمانہ جذبات کی رو میں بہہ جانے کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس عہد میں نفس انسان کے جذبات پر پوری طرح غالب آجاتا ہے آج جب کہ مجھے اپنی پارسائی کا دعویٰ ہے۔ لیکن پارسائی کے اس زمانے میں بھی دور ہوس کا فسانہ مجھے یاد آتا ہے۔

9.3 جگر مرادآبادی

9.3.1 تعارف اور غزل گوئی:

جگر کا نام علی سکندر تھا اور انہوں نے جگر تخلص اختیار کیا تھا۔ ان کے والد علی نظر ٹونک کے ملازم تھے اور اسی کے ساتھ بنارس میں مقیم تھے۔ جگرؔ 1890ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ جگر چھے ماہ کے ہوئے تو ان کے والد بنارس سے واپس مرادآباد آ گئے۔ جگر نے شعری ذوق ورثے میں پایا تھا۔ ان کے پردادا، دادا اپنے وقت کے اچھے شاعر تھے۔ جگر کے والد مولوی علی نظر اور چچا مولوی علی ظفر ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے تھے۔

جگر کو عربی، فارسی اور علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے لکھنؤ بھیج دیا گیا۔ انگریزی تعلیم سے جگر کو دلچسپی نہیں تھی۔ نویں جماعت میں دو بار فیل ہوئے، اسی عرصہ میں والد کا انتقال ہو گیا اور جگر کو مرادآباد واپس آنا پڑا۔ 12 برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ ابتدا میں داغ دہلوی سے اصلاح لی۔ بعد میں رساؔ اور تسلیمؔ کی شاگردی اختیار کی۔ اصغر گونڈوی کے ساتھ جگر کو گہری عقیدت تھی۔ اصغر کی صحبت نے جگر کی شخصیت اور ان کے فن کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ زندگی کے آخری ایام میں مذہبی ہو گئے تھے اور حج بھی کر لیا تھا۔

جگر کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا شعری مجموعہ 'داغِ جگر' 1928ء میں شائع ہوا۔ 1934ء میں دوسرا شعری مجموعہ 'شعلۂ طور' شائع ہوا۔ جگر کا تیسرا مجموعہ 'آتش گل' کے نام سے پہلی بار پاکستان سے 1954ء میں شائع ہوا۔ اسی مجموعے پر جگر کو ساہتیہ اکیڈمی اعزاز سے نوازا گیا۔ جگر نے مرادآباد چھوڑ کر گونڈہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور وہیں 1960ء میں ان کا انتقال ہوا۔

جگر مرادآبادی کا شمار اردو زبان کے اہم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ غزل کے شاعر ہیں۔ جگر بنیادی طور پر ایک روایتی شاعر ہیں۔ اسی لیے ان کی غزلوں کا خاص موضوع حسن و عشق ہے۔ جگر کی شاعری میں سرمستی اور سرشاری کی کیفیت ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ حسن و عشق کی مختلف کیفیات اور جذبات کو انہوں نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اور انفرادی لہجے میں بیان کیا ہے۔ جگر کی شاعری فلسفیانہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایک صداقت ہے۔ ان کی ذات اور ان کی شاعری میں تضاد نہیں ہے، مطابقت ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ان کی شاعری کو ان کی ذات کا پرتو کہا ہے۔ ان کی شاعری کیف و حال کا آئینہ ہے۔

جگر کی شاعری میں رمز و اشاریت ہے، سوز و گداز ہے۔ ان کی شاعری میں استعاروں اور کنایوں کی کثرت ہے۔ اس میں تصوف کی چھاپ بھی ہے اور حسن و عشق کی آب و تاب بھی۔ جگر کی شاعری میں اس قدر اثر اور گداز ہے کہ یہ سیدھے دل میں اتر جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک خاص طرح کی روحانیت اور پاکیزگی کا احساس نمایاں ہے۔ جگر کے یہاں عشق کا پاکیزہ اور لطیف تصور ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ وصال کے بجائے ہجر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لیے جگر کو ہجر کا شاعر مانا جاتا ہے۔ عشق ان کے نزدیک کوئی لین دین کا کاروبار نہیں ہے۔ اسی لیے حسن کی موجودگی اور عدم موجودگی ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

جگر کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو ان کا جمالیاتی احساس ہے۔ ان کا لہجہ فطری ہے۔ سادگی، روانی اور موسیقیت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ انہی خصوصیات کی بنا پر ان کی شاعری میں لطف اور تاثیر بہت زیادہ ہے۔

جگر کی شاعری اپنی منفرد شعری لب و لہجے اور سرشاری کی کیفیت اور تاثیر کی وجہ سے ان کے دور میں ہی بے حد مقبولیت اختیار کر گئی تھی۔ ان کے اشعار ضرب المثل بن گئے جو آج بھی عوام و خواص کی زبان پر جاری رہتے ہیں۔

9.3.2 غزل اور غزل کی تشریح:

شب فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے	کچھ اس میں ان کی توجہ بھی پائی جاتی ہے
یہ عمرِ عشق یوں ہی کیا گنوائی جاتی ہے	حیات زندہ حقیقت بنائی جاتی ہے
بنا بنا کے جو دنیا مٹائی جاتی ہے	ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے
ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے	مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے
خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے	وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے
گناہ گار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد	یہیں کہیں تری جنت بھی پائی جاتی ہے
نہ سوز عشق نہ برق جمال پر الزام	دلوں میں آگ خوشی سے لگائی جاتی ہے
کچھ ایسے بھی تو ہیں رندان پاک باز جگر	کہ جن کو بے مے و ساغر پلائی جاتی ہے

تشریح:

شب فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے
کچھ اس میں ان کی توجہ بھی پائی جاتی ہے

یہ شعر محبوب کی جدائی (فراق) میں گزرتی ہوئی رات کے منظر کو بیان کرتا ہے۔ شب فراق یعنی محبوب سے جدائی کا وقت، جب دل پر غم اور تنہائی کا بوجھ ہوتا ہے ایسے وقت میں نیند آرہی ہے، جو عام طور پر ممکن نہیں ہوتا کیونکہ فراق کی راتیں بے قراری سے بھرپور ہوتی ہیں۔ لیکن شاعر کو شک ہے کہ اس غیر معمولی سکون کی کوئی خاص وجہ ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس سکون اور نیند میں محبوب کی طرف سے کچھ توجّہ یا عنایت شامل ہے۔ یعنی شاعر کے دل کو یہ گمان ہو رہا ہے کہ شاید محبوب نے دل ہی دل میں کچھ رحم کیا ہے، کچھ دھیان دیا ہے، جس کی وجہ سے جدائی کی رات میں بھی نیند آنے لگی ہے۔

یہ عمر عشق یوں ہی کیا گنوائی جاتی ہے
حیات زندہ حقیقت بنائی جاتی ہے

شاعر کہتا ہے کہ یہ جو عشق کرنے کی عمر ہے اسے یوں بے کار میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اس عمر میں عشق کی ایسی مثال پیش کرنی چاہیے کہ زندگی زندہ حقیقت بن جائے یعنی اس زندگی کو لازوال اور یادگار بنانا چاہیے۔

بنا بنا کے جو دنیا مٹائی جاتی ہے
ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کو بار بار مٹایا جاتا ہے اور پھر بنانے کی کوشش ہوتی ہے یعنی یہ جو تخریب اور تعمیر کا سلسلہ ہے وہ اس لیے ہے کہ اس میں ضرور کوئی کمی ہے اسی لیے اسے بار بار مٹانے اور بنانے کا سلسلہ چل رہا ہے۔

ہمیں پہ عشق کی تہمت لگائی جاتی ہے
مگر یہ شرم جو چہرے پہ چھائی جاتی ہے

شاعر کہتا ہے عشق کی تہمت ہم پر ہی لگائی جاتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے کہ عشق کی خطا صرف ہم سے ہی سرزد ہوئی ہو۔ عشق کے ذکر پر محبوب کے چہرے پر شرم سے جو سرخی چھائی ہوئی ہے وہ بتارہی ہے کہ ادھر بھی عشق کی آگ ہے تو تہمت ہمیں پر کیوں لگائی جاتی ہے۔

خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے
وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے

شاعر دعا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خدا کرے کہ وہ زندگی جو، اب صرف باتوں اور الفاظ تک محدود ہے، حقیقت میں بھی بن جائے۔ یعنی آج کل لوگ زندگی کی اچھائیوں، سچائی اور ایمان داری کے اصولوں، محبت، امن، سکون، خلوص وغیرہ کی باتیں تو کرتے ہیں، لیکن عمل میں اُن کا وجود نہیں ہوتا۔ ایسی زندگی صرف زبان تک رہ گئی ہے۔

گناہ گار کے دل سے نہ بچ کے چل زاہد
یہیں کہیں تری جنت بھی پائی جاتی ہے

شاعر زاہد کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے زاہد! گناہ گار کے دل سے بچ کر مت گزر، یعنی گناہ گار سے دور مت ہو۔ رحمتِ خداوندی صرف زاہدوں، عابدوں یا ظاہری نیکی کرنے والوں تک محدود نہیں۔ گناہ گار کا دل بھی محبتِ الٰہی، سچائی، ندامت اور روحانی سچائی سے لبریز ہو سکتا ہے۔ شاعر یہ کہتا ہے کہ تم جسے گناہ گار سمجھ کر حقیر سمجھتے ہو، ممکن ہے وہی دل خدا کے قریب ہو، اور وہی دل تمہیں حقیقی نجات یا "جنت" کی راہ دکھادے۔

نہ سوز عشق نہ برق جمال پر الزام
دلوں میں آگ خوشی سے لگائی جاتی ہے

یہ شعر انسانی رویّوں کی منافقت پر ایک گہرا تبصرہ ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ دلوں میں جلنے کی جو آگ پائی جاتی ہے، وہ ہمیشہ کسی فطری یا خارجی عنصر (عشق یا حسن) کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ اکثر لوگ خود اس کو شعوری طور پر لگاتے ہیں۔ یہ ایک سماجی طنز بھی ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کے جذبات سے کھیلنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ شعر ایک تلخ سچائی اور نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، کہ دلوں میں لگنے والی آگ — یعنی جلنے، حسد، یا بے قراری کی کیفیت — ہمیشہ عشق یا حسن کی وجہ سے نہیں ہوتی۔

کچھ ایسے بھی تو ہیں رندان پاک باز جگرؔ
کہ جن کو بے مے و ساغر پلائی جاتی ہے

شاعر کہتا ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ سب کو جام یا پیالے سے ہی پلائی جائے۔ بہت سے رندان پاک باز ہیں جو شراب نہیں

پیتے لیکن انہیں کسی دوسرے طریقے سے عشق کی شراب پلا کر مدہوش کر دیا جاتا ہے۔ اس شعر میں عشق حقیقی کا تصور پیش کیا گیا ہے۔

9.4 مشقیں

مشق 1: درج ذیل جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ جگر کا پورا نام سید فضل الحسن تھا۔ ( )

2۔ حسرت موہانی کو سیاست سے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ ( )

3۔ حسرت کی غزلوں میں قدیم اور جدید دونوں رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔ ( )

4۔ جگر مراد آبادی بنارس میں پیدا ہوئے۔ ( )

5۔ جگر کے اشعار ضرب المثل بن گے، جو آج بھی عوام و خواص کی زبان پر جاری رہتے ہیں۔ ( )

مشق 2: درج ذیل مصرعوں کو مکمل کیجیے،

1۔ چپکے چپکے رات دن آنسو..

2۔ چوری چوری ہم سے تم آکر ملے تھے..

3۔ تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک..

4۔ گناہ گار کے دل سے نہ بچ کے..

5۔ بنا بنا کے جو دنیا..

مشق 3: درج ذیل مصرعوں میں قافیہ کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ سچ کہو کچھ تم کو بھی وہ کارخانہ یاد ہے

2۔ مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانہ یاد ہے

3۔ آج تک عہد ہوس کا وہ فسانہ یاد ہے

4۔ شب فراق ہے اور نیند آئی جاتی ہے

5۔ ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے

مشق 4۔ درج ذیل مصرعوں کے الفاظ کو ٹھیک ترتیب سے لگا کر مصرع درست کیجیے۔

1۔ الزام عشق نہ برق نہ سوز جمال پر

2۔ حقیقت میں بن جائے خدا کرے کہ زندگی

3۔ جنت یہیں کہیں تری بھی جاتی ہے پائی

4۔ یاد ہے چھپے راتوں کو آنا وہ ترا چوری

5۔ میرے بلانے دھوپ میں کے لیے دوپہر کی

مشق 5: درج ذیل جملوں میں خالی جگہوں کو پُر کیجیے۔

1۔ حسرت کی شخصیت ہمہ جہت تھی اور وہ مختلف.................. اور صلاحیتوں کے حامل تھے۔

2۔ حسرت کی غزلوں کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں............... نظر آتا ہے۔

3۔ عربی، فارسی اور علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی تعلیم کے لیے جگر کو............ بھیج دیا گیا۔

4۔ جگر کی شاعری کا ایک نمایاں پہلوان کا.................. احساس ہے۔

5۔ جگر کا پہلا شعری مجموعہ.................. 1928ء میں شائع ہوا۔

9.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- حسرت موہانی کا پورا نام سید فضل الحسن اور تخلص حسرت تھا۔ والد کا نام سید اظہر حسین تھا۔ حسرت موہانی 1881ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔
- 1903ء میں حسرت نے ایک رسالہ 'اردوئے معلیٰ' جاری کیا۔ اپنی شاعری اور اپنی صحافتی سرگرمیوں کے ذریعے بھی انہوں نے آزادی کی لڑائی میں نمایاں کردار ادا کیا۔
- حسرت کی غزلوں میں قدیم اور جدید دونوں رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے۔ حسرت کی غزلوں کا خاص موضوع حسن و عشق ہے۔
- جگر کا اصل نام علی سکندر تھا اور جگر تخلص اختیار کیا۔ جگر کے والد علی نظر والیٔ ٹونک کے ساتھ بنارس میں مقیم تھے اسی دوران 1890ء میں بنارس میں جگر پیدا ہوئے۔
- جگر کے کل تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'داغ جگر' 1928ء میں شائع ہوا۔ 1934ء میں دوسرا شعری مجموعہ 'شعلۂ طور' شائع ہوا۔ جگر کا تیسرا مجموعہ 'آتش گل' کے نام سے پہلی بار پاکستان سے 1954ء میں شائع ہوا۔ اسی مجموعے پر جگر کو ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔
- جگر بنیادی طور پر ایک روایتی شاعر ہیں۔ اسی لیے ان کی غزلوں کا خاص موضوع حسن و عشق ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ حسن و عشق کی مختلف کیفیات اور جذبات کو جگر نے اپنی غزلوں میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اور انفرادی لہجے میں بیان کیا ہے۔

9.6 مشکل الفاظ

اصلاح	درستگی، بہتری	Correction, improvement
ہمہ جہت	کئی خوبیوں والی شخصیت	Multidimensional
خطیب	تقریر کرنے والا	Orator, speaker
صعوبتیں	تکلیفیں، مشکلات	Hardships, sufferings
ریزولیوشن	قرارداد، تجویز	Resolution, proposal

آمیزش	ملاپ، امتزاج	Mixture, blend
مساوات	برابری	Equality
تغزل	غزل کا خاص رنگ	Lyricism
وجد	روحانی کیفیت	Ecstasy, trance
تصنع	بناوٹ، غیر فطری پن	Artificiality
ہمہ جہت	ہر پہلو سے مکمل	Multi-dimensional
نگاہ شوق	محبت بھری نظر	Affectionate gaze
پابوسی	قدم چومنا	Kissing the feet (symbol of deep respect)
برگشتہ	منہ موڑ لینا	Turned away
ادعا	دعویٰ	Claim
اتقا	پرہیزگاری	Piety
علوم شرقیہ	مشرقی علوم (عربی، فارسی وغیرہ)	Oriental studies
سرمستی	مستی، خوشی کی کیفیت	Ecstasy
سرشاری	کیف و وجد کی حالت	Exhilaration
مطابقت	ہم آہنگی	Harmony
پرتو	عکس، جھلک	Reflection
مادیت زدہ	مادی چیزوں میں الجھا ہوا	Materialistic
سرشاری	خوشی سے بھرپور کیفیت	Elation

9.7 نمونہ امتحانی سوالات

9.7.1 معروضی سوالات:

1۔ حسرت موہانی کا اصل نام کیا تھا؟

(a) سید شوکت علی (b) سید فضل الحسن (c) سید سجاد حیدر (d) سید آفتاب احمد

2۔ حسرت موہانی نے بی۔ اے کہاں سے کیا؟

(a) دہلی کالج (b) لکھنؤ یونیورسٹی (c) الہ آباد یونیورسٹی (d) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

3۔ 'اردوئے معلیٰ' کس نے جاری کیا؟

(a) جگر (b) حسرت (c) اقبال (d) سرسید

4۔ حسرت موہانی کی شاعری کا انداز بیان کیسا تھا؟

(a)مشکل اور مصنوعی　(b)فلسفیانہ　(c)سادہ اور فطری　(d)تجریدی اور علامتی

5۔ حسرت نے ابتدائی شعری اصلاح کس سے لی؟

(a) جگر مرادآبادی　(b) تسلیم لکھنوی　(c) اصغر گونڈوی　(d)یاس یگانہ چنگیزی

6۔ جگر مرادآبادی کا اصل نام کیا تھا؟

(a)علی ظفر　(b)علی سکندر　(c)علی نظر　(d)علی رضا

7۔ جگر نے ابتدائی شعری اصلاح کس سے لی؟

(a) داغ دہلوی　(b) تسلیم لکھنوی　(c) اصغر گونڈوی　(d)یاس یگانہ چنگیزی

8۔ جگر کے پہلے شعری مجموعے کا نام کیا تھا؟

(a)آتشِ گل　(b)شعلۂ طور　(c)داغِ جگر　(d)سوزِ وگداز

9۔ جگر مرادآبادی کی شاعری کا نمایاں موضوع کیا ہے؟

(a) سیاست　(b) مذہب　(c) حسن وعشق　(d)تصوف

10۔ جگر کے نزدیک عشق کا کون سا تصور اہم ہے؟

(a)جسمانی　(b)مادی　(c)روحانی　(d)تجارتی

9.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ حسرت کی شاعرانہ خصوصیات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

2۔ جگر کی غزلوں کی حوالے سے ان کی شاعری پر روشنی ڈالیے۔

3۔ حسرت کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

4۔ جگر کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

5۔ شامل نصاب جگر کی غزل سے قوافی کا انتخاب کیجیے۔

9.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جگر کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان اشعار کی تشریح کیجیے:

خدا کرے کہ حقیقت میں زندگی بن جائے
وہ زندگی جو زباں تک ہی پائی جاتی ہے
بنا بنا کے جو دنیا مٹائی جاتی ہے
ضرور کوئی کمی ہے کہ پائی جاتی ہے

2۔ حسرتؔ کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان اشعار کی تشریح کیجیے:

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے
دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

3۔ شامل نصاب غزل میں حسرت کی غزل کے قوافی کا انتخاب کرتے ہوئے انہیں جملوں میں استعمال کریں۔

9.7.1 کے جوابات:

B (i)	C (ii)	A (iii)	C (iv)	A (v)
B (vi)	A (vii)	B (viii)	C (ix)	C (x)

اکائی 10: غزل

فراق گورکھپوری، ناصر کاظمی

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید
10.1 مقاصد
10.2 فراق گورکھپوری
10.2.1 فراق گورکھپوری کا تعارف
10.2.2 فراق گورکھپوری کی غزل گوئی
10.2.3 غزل: (متن)
10.2.4 تشریح
10.3 ناصر کاظمی
10.3.1 ناصر کاظمی کا تعارف
10.3.2 ناصر کاظمی کی غزل گوئی
10.3.3 غزل:(متن)
10.3.4 تشریح
10.4 اکتسابی نتائج
10.5 نمونہ امتحانی سوالات

10.0 تمہید

فراق گورکھپوری اور ناصر کاظمی کا شمار جدید اردو غزل کے اہم شعرا میں ہوتا ہے، لیکن ان دونوں کی غزلیں اپنے اپنے انداز سے منفرد ہیں۔ فراق گورکھپوری کی غزل گوئی کلاسیکی روایت اور جدید خیالات کا حسین امتزاج ہے۔ ان کی شاعری میں عشق، حسن، انسانیت اور فلسفہ زندگی کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ فراق نے اردو غزل کو فکری وسعت اور جذباتی گہرائی عطا کی اور اپنے رومانوی انداز سے غزل کو ایک نیا آہنگ دیا۔

ناصر کاظمی کی غزلیں سادگی، نرمی اور جذباتی تہذیب کی عمدہ مثال ہیں۔ ان کی شاعری میں ہجرت کا درد، تنہائی کا کرب اور ماضی کی یادوں کی گہری جھلک ملتی ہے۔ ناصر کاظمی نے چھوٹے اور عام الفاظ کے ذریعے گہری معنویت پیدا کی،

جس سے ان کی غزلیں قاری کے دل میں اتر جاتی ہیں۔اس اکائی میں ہم ان شعرا کی ایک ایک غزل کی قرأت کریں گے اور ان کی تشریح بھی کریں گے۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- فراق گورکھپوری کا تعارف پیش کر سکیں۔
- فراق گورکھپوری کی غزل گوئی پر تبصرہ کر سکیں۔
- فراق گورکھپوری کی غزل کی تشریح کر سکیں۔
- ناصر کاظمی کا تعارف پیش کر سکیں۔
- ناصر کاظمی کی غزل گوئی پر تبصرہ کر سکیں۔
- ناصر کاظمی کی غزل کی تشریح کر سکیں۔

10.2 فراق گورکھپوری

10.2.1 فراق گورکھپوری کا تعارف:

فراق گورکھپوری 28 اگست 1896 کو گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام رگھوپتی سہائے اور تخلص فراقؔ تھا۔ ان کے والد منشی گورکھ پرساد عبرتؔ بھی شاعر تھے۔ فراق کا شمار اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ گریجویشن کے بعد پی سی ایس اور پھر آئی سی ایس کے لیے منتخب ہوئے لیکن گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون سے متاثر ہو کر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ اس تحریک میں شامل ہونے کی وجہ سے انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ رہائی کے بعد انہوں نے انگریزی سے ایم۔اے کیا اور اس کے بعد 1930 میں الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہو گئے۔ طویل علالت کے بعد 1982 میں پچاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے شعری مجموعے "گل نغمہ" پر انہیں گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

فراق ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں رہے لیکن انہوں نے ان مسائل اور موضوعات کو اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے جو ترقی پسند تحریک کی اساس ہیں۔ فراق غیر معمولی تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے۔ وہ ممتاز شاعر ہونے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے بہترین نقاد بھی تھے۔ "اردو کی عشقیہ شاعری"، "اردو غزل گوئی" ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ "اندازے" اور "حاشیے" ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل کتابیں ہیں۔ شاعری میں ان کا سرمایہ بہت ضخیم ہے۔ "روح کائنات"، "مشعل"، "روپ"، "شبستاں"، "گل نغمہ"، "تحفۂ خوشتر"، "شعلۂ ساز"، "رمز و کنایت"، "ہزار داستان"، "غزلستان"، "شعرستان"، "نغمہ نما" اور "پچھلی رات" فراق گورکھپوری کے شعری مجموعے ہیں۔

10.2.2 فراق گورکھپوری کی غزل گوئی:

فراق گورکھپوری کا شمار اردو غزل کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ فراق براہ راست ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں رہے تاہم ان

کی شاعری میں ترقی پسند عناصر کی آمیزش نظر آتی ہے۔ان کے فن کی نشو ونما کے دور میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ کوئی بھی حساس اور انسان دوست فنکار اپنے ارد گرد کے ماحول اور فضا سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ فراق نے اپنے دور کے ان مسائل اور معاملات کو بھی بیان کیا جو اشتراکی اور اجتماعی تھے۔ فراق کی ادبی سرگرمیاں بیسویں صدی کی سات دہائیوں پر محیط ہیں۔انھوں نے شاعری میں اپنے منفرد لب و لہجہ اور مخصوص رنگ وآہنگ کی بنا پر ایک الگ شناخت قائم کی اور اردو شاعری کو نئے اسلوب اور دلکش لب و لہجہ سے ہم آہنگ کیا۔ فراق نے غزل کے علاوہ نظم اور رباعی بھی لکھی ہیں، لیکن غزل ان کی محبوب صنف سخن تھی۔ غزل کے بارے میں فراق کا خیال تھا کہ ”غزل شاعری نہیں عطر شاعری ہے“۔ ابتدا میں فراق ایک روایتی شاعر کے طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں اور ان کی شاعری میں میر، امیر اور مومن کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ مگر فنی وفکری پختگی اور بدلتے ہوئے ادبی اور سماجی منظر نامے کے ساتھ فراق کا فن روایت سے نکل کر بغاوت اور پھر آفاقی بصیرت اور روح کائنات کی گزر گاہوں میں داخل ہو جاتا ہے۔ عموماً ان کی شاعری کا مجموعی تاثر رومانی ہے، تاہم انہوں نے ترقی پسند نظریات کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ فراق نے ترقی پسند موضوعات کو بحسن وخوبی غزل کے پیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ حسن و عشق کے رمز آشنا تو ہیں ساتھ ہی تاریخی اور تہذیبی داستان گو بھی ہیں اور زمانے کی نئی آہٹوں کو محسوس کر کے انہیں لفظوں کے حسین پیکر میں ڈھالنے والے فنکار بھی ہیں۔ فراق کا لہجہ اور اسلوب منفرد ہے۔ ان کا اپنا ہی مخصوص رنگ اور آہنگ ہے۔ فراق نے اردو غزل کو ہندی اور ہندوستان کی خوشبو سے ہمکنار کیا۔ فراق کی غزلوں میں ہندوستان کے تہذیبی عناصر اور ہندی زبان کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔

فراق کی غزلوں کا عام موضوع حسن و عشق ہے لیکن انہوں نے اجتماعی مسائل، سماج کے مشترکہ اقدار اور معاملات پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔ فراق نے حسن و عشق کے روایتی موضوع میں بھی اپنے مخصوص طرز اظہار، منفرد لفظیات، نئی تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال سے نئی تازگی اور نیا پن پیدا کر دیا ہے۔ ان کے یہاں جنسی تجربہ جمالیاتی احساس اور نادر تشبیہوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے:

شب وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

فراق کی غزلوں میں سماج کے مختلف پہلو اور تصویریں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے۔ وہ ایک نئے سماج اور نئے نظام کی تشکیل کے خواب دیکھتے ہیں:

اے نظام کہن کچھ آہٹ لے
وہ دبے پاؤں موت آئی دیکھ

فراق اپنے دور کے انسان کی کربناک زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھ کر غمزدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ انسان کو خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔ فراق انسانی سماج میں امن وامان کے خواہاں ہیں۔ وہ انسان کے درد اور اس کی انتہائی کرب کو دیکھ کر بے چین ہو اٹھتے ہیں۔ ان کی یہ بے چینی ان کی غزلوں میں سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر موثر انداز میں ظاہر ہوتی ہے:

کچھ اب تو امان ہو کہ دنیا   کتنی ہلکان ہو گئی ہے
اس دور میں زندگی بشر کی   بیمار کی رات ہو گئی ہے

فراق نے انقلاب اور بغاوت کے نعرے بھی بلند کیے ہیں لیکن ان کے انداز بیان میں جوش اور للکار کی شدت نہیں ہے۔ وہ حقیقت کا اظہار شائستگی اور سنجیدگی سے کرتے ہیں:

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل   وہ رات ہے کہ کوئی ذرہ محو خواب نہیں
رکی رکی سی شب مرگ ختم پر آئی   وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

فراق کا انداز بہت دلکش ہے۔ اسلوب منفرد اور موثر ہے۔ فراق کی غزلوں میں موضوع کے اعتبار سے بھی کافی تنوع نظر آتا ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات کو اپنے مخصوص لہجے میں انتہائی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر اس دور کے انسان کی زندگی، اس کے مسائل، سماجی معاملات اور اس دور کی کربناک صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔

10.2.3 غزل: (متن)

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
مری نظریں بھی ایسے قاتلوں کا جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں
جسے کہتی ہے دنیا کامیابی وائے نادانی
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں
نگاہ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں
خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں
حیات عشق کا اک اک نفس جام شہادت ہے
وہ جان ناز برداراں کوئی آسان لیتے ہیں
ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی

مری باتیں بعنوان دگر وہ مان لیتے ہیں
تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رمزیت
کہ اس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں
اب اس کو کفر مانیں یا بلندیٔ نظر جانیں
خدائے دو جہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں
جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں
تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبار الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر احسان لیتے ہیں
ہماری ہر نظر تجھ سے نئی سوگندھ کھاتی ہے
تو تیری ہر نظر سے ہم نیا پیمان لیتے ہیں
رفیق زندگی تھی اب انیس وقت آخر ہے
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں
زمانہ واردات قلب سننے کو ترستا ہے
اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں
فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

10.2.4 تشریح:

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

غزل کے پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہم نے زندگی کو اس قدر قریب سے دیکھا ہے، اس کے ہر رنگ کو جھیلا ہے، کہ اب ہم اس کی آمد کی آہٹ، اس کے انداز اور اس کے ممکنہ رخ کو پہلے ہی سے بھانپ لیتے ہیں۔ یعنی اب ہمیں کسی حادثے، کسی فریب، کسی خوشی یا کسی غم کے آنے سے پہلے ہی اس کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہاں زندگی سے مراد محبوب بھی ہو سکتا ہے کہ جس کی آمد کو قدموں کی آہٹ یا اس کے چلنے کے مخصوص انداز سے عاشق پہچان لیتا ہے۔

مری نظریں بھی ایسے قاتلوں کا جان و ایماں ہیں
نگاہیں ملتے ہی جو جان اور ایمان لیتے ہیں

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ میری نظریں بھی ایسے دلکش اور خطرناک محبوبوں کی جان و ایمان ہیں، یعنی وہ ان کی محبوب ترین شے بن جاتی ہیں۔جب وہ قاتل مزاج لوگ میری نظروں سے نگاہ ملاتے ہیں، تو میری جان اور ایمان چھین لیتے ہیں،یعنی میں مکمل طور پر اُن کے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہوں۔لیکن جن کے عشق میں میں گرفتار ہوتا ہوں خود وہ بھی میری نظروں کو عزیز رکھتے ہیں۔

جسے کہتی ہے دنیا کامیابی وائے نادانی
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ مجھے حیرت ہے دنیا جسے کامیابی سمجھتی ہے اور جس کے پیچھے بھاگتی ہے وہ حقیقت میں کچھ نہیں ہے۔جو لوگ خود کو کامیاب سمجھتے ہیں وہ اس بات پر بھی غور کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ کامیابی کس قیمت پر حاصل کی ہے۔اسے پانے کے لیے انہیں کیا کیا کھونا پڑا ہے۔

نگاہ بادہ گوں یوں تو تری باتوں کا کیا کہنا
تری ہر بات لیکن احتیاطاً چھان لیتے ہیں

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے شراب کے پیالوں جیسی آنکھوں والے یعنی مست آنکھوں والے محبوب، تری باتیں تو ہمیشہ درست ہی ہوتی ہیں۔تری باتوں کا کیا کہنا ہے لیکن پھر بھی احتیاطاً ہم ان پر غور کر لیتے ہیں۔آنکھ بند کر کے ان پر اعتبار نہیں کرتے۔

طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں

اس شعر میں شاعر نے تنہائی اور یادوں کی شدت کو بیان کیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ سنسان اور خاموش راتوں میں جب دل گھبرانے لگتا ہے، تو وہ محبوب کی یادوں کی چادر اوڑھ لیتا ہے، یعنی اُس کی یادوں میں پناہ لیتا ہے تاکہ دل کو سکون ملے۔یہ شعر تنہائی، اداسی اور یادوں کی حرارت کا خوبصورت اظہاریہ ہے۔

خود اپنا فیصلہ بھی عشق میں کافی نہیں ہوتا
اسے بھی کیسے کر گزریں جو دل میں ٹھان لیتے ہیں

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ عشق میں صرف اپنا فیصلہ کافی نہیں ہوتا، محبوب کی مرضی کا بھی دخل ہوتا ہے۔اس لیے اگر کوئی بات دل میں ٹھان لیں یا فیصلہ کر لیں کہ ایسا کرنا ہے لیکن نہیں کر سکتے۔کیوں کہ محبوب کی ناراضگی کا خیال ہوتا ہے۔

حیات عشق کا اک اک نفس جام شہادت ہے
وہ جان ناز برداراں کوئی آسان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ عشق میں جو زندگی گزرتی میں اس کی ہر سانس گویا ایک جام شہادت ہے۔محبوب ایسا ستم گر ہے کہ وہ ناز برداروں یعنی عاشقوں کی جان ہلکی آزمائش سے نہیں لیتا بلکہ ان پر ہزاروں ستم ڈھاتا ہے۔

ہم آہنگی میں بھی اک چاشنی ہے اختلافوں کی
مری باتیں بعنوان دگر وہ مان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ ہمارے درمیان ہم آہنگی بھی ہو تو بھی اختلاف کی چاشنی بنی رہتی ہے۔یعنی اتحاد میں بھی کچھ نہ کچھ اختلاف رائے ہو ہی جاتا ہے لیکن محبوب ہماری جس بات سے اختلاف کرتا ہے بعد میں کسی دوسرے طریقے سے ہماری بات مان ہی لیتا ہے۔

تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رمزیت
کہ اس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ تجھے اس لیے لوگ مانتے ہیں اور لوگوں میں تیری مقبولیت اس لیے ہے کیونکہ تیری شخصیت میں رمزیت و پُراسراریت ہے یعنی وہ تیری شخصیت کو جانتے نہیں ہے۔لوگ جس کو جان لیتے ہیں اسے کہاں مانتے ہیں۔وہ اسی کو مانتے ہیں جس کو جانتے اور سمجھتے نہیں ہیں۔تو پُراسرار ہے اس لیے لوگ تجھے مانتے ہیں۔

اب اس کو کفر مانیں یا بلندیٔ نظر جانیں
خدائے دو جہاں کو دے کے ہم انسان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ ہم انسانیت کو سب سے اوپر رکھتے ہیں اور مذہبی معاملات کو انسان کے اوپر ترجیح نہیں دیتے۔ہمارے اس اصول کو چاہے کوئی کفر کہے یا ہماری بلندیٔ نظر سمجھے۔

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کی صورت اس کی سیرت کا پتہ دیتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے عبارت (لکھے ہوئے الفاظ یا تحریر) پڑھ کر اس کے معنی اور مطلب سمجھ میں آجاتا ہے۔اس طرح کسی انسان کی صورت سے اس کی سیرت کا پتہ چل جاتا ہے۔

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبار الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر احسان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب ہم تجھے محبت کے کاروبار میں نقصان نہیں ہونے دیں گے۔اگر ضرورت پڑی تو ہم سارا قصور اپنے سر لے لیں گے اور تجھ پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔

ہماری ہر نظر تجھ سے نئی سوگندھ کھاتی ہے
تو تیری ہر نظر سے ہم نیا پیمان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب میری ہر نظر تجھ سے ایک نئی قسم کھاتی ہے یعنی محبت میں قایم و دایم رہنے کی قسم کھاتی ہے اور تیری ہر نظر بھی مجھ سے نیا عہد و پیمان باندھتی ہے۔

رفیق زندگی تھی اب انیس وقت آخر ہے
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے کہ موت زندگی کی ساتھی تھی یعنی سائے کی طرح زندگی کے ساتھ تھی اور اب آخری وقت میں ہم سفر ہے۔ شاعر موت کو مخاطب کر کے کہتا ہے اے موت ہم پر یہ تیرا دوسرا احسان ہے۔ یعنی ایک احسان وہ تھا کہ تو زندگی میں سائے کی طرح رہی اور اب تو آخری وقت میں ہماری ہم سفر ہے یہ تیرا دوسرا احسان ہے۔

زمانہ واردات قلب سننے کو ترستا ہے
اسی سے تو سر آنکھوں پر مرا دیوان لیتے ہیں

شاعر کہتا ہے لوگ مرے کلام کو سر آنکھوں پر لیتے ہیں یعنی بہت پسند کرتے ہیں کیونکہ میرا کلام سچے جذبات اور قلبی واردات کا اظہار ہے۔ آج کل لوگوں کو ایسا کلام سننے کو نہیں ملتا جب کہ لوگ ایسا کلام سننے کو ترستے ہیں۔

فراقؔ اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

یہ غزل کا آخری شعر یعنی مقطع ہے۔ اس میں شاعر کہتا ہے کہ کوئی محبت کا فریب دینے والا ہمیں بھیس بدل بدل کر ملتا ہے اور ہمیں اپنے دام محبت میں گرفتار کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے لیکن ہم اسے پہچان لیتے ہیں اور اس کے فریب میں نہیں آتے۔

مشکل الفاظ:

الفاظ	:	معنی
نگاہ بادہ گوں	:	شراب جیسی نشیلی نظر
جان ناز برداراں	:	ناز اٹھانے والے کی زندگی
چاشنی	:	لذت، ذائقہ، مٹھاس
بعنوان دیگر	:	کسی اور عنوان سے، کسی اور انداز سے
رمزیت	:	اشاریت، علامتی انداز
بلندی نظر	:	اعلیٰ سوچ، بلند نظریہ
عبارت	:	لکھا ہوا جملہ، لکھی ہوئی تحریر
سیرت	:	کردار، باطنی خوبیاں
سوگندھ	:	قسم
انیس وقت آخر	:	موت کے وقت کا ساتھ
دیوان	:	شاعری کا مجموعہ جو حروف تہجی کی ترتیب میں ہو
واردات قلب	:	دل کی کیفیات، دل کی باتیں
سر آنکھوں پر لینا	:	بڑی خوشی سے قبول کرنا، عزت واحترام سے قبول کرنا
کافر	:	یہاں پر کافر سے مراد ہے محبت میں اذیت دینے والا

مشقیں:

مشق 1: دیے گئے جملوں میں صحیح اور غلط کی نشاندہی کیجیے۔

1۔ فراق گورکھپوری کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا۔ (   )

2۔ ""گل نغمہ " فراق گورکھپوری کی تنقیدی کتاب ہے۔ (   )

3۔ فراق گورکھپوری الہ آدیونیورسٹی میں اردو کے لکچر رتھے۔ (   )

مشق 2: ذیل کے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ کوشش ....

2۔ شاعری ....

3۔ دیوان ....

10.3 ناصر کاظمی

10.3.1 ناصر کاظمی کا تعارف:

اردو کے مشہور شاعر ناصر کاظمی کا پورا نام سید ناصر رضا کاظمی اور تخلص ناصر تھا۔وہ صوبۂ ہریانہ کے شہر انبالہ میں8/ دسمبر 1925 کو پیدا ہوئے۔ان کے دادا سید شریف الحسن پولیس انسپکٹر تھے اور والد محمد سلطان کاظمی رائل انڈین آرمی میں صوبیدار میجر کے عہدے پر فائز تھے۔جگر کی بیماری کی وجہ سے 1949 میں انتقال کر گئے۔ان کی ماں کنیزہ محمدی بہت ہی نیک دل اور حساس خاتون تھیں ۔انھیں شعر و شاعری سے خاص شغف تھا اور مشن گرلز اسکول میں بحیثیت معلمہ اپنے فرائض انجام دے رہی تھیں۔1952 میں ناصر کی شادی ان کی خالہ زاد بہن شیفتہ تسکین سے ہوئی ۔یہ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور سیر و تفریح کے لیے باہر بھی گھمانے لے جایا کرتے تھے۔ان سے دو اولادیں ہوئیں،بڑے صاحب زادے باصر سلطان کاظمی جو فی الوقت براڈ فورڈ یونیورسٹی میں Writing Skill کی تعلیم دیتے ہیں اور چھوٹے صاحب زادے حسن سلطان کاظمی ایم۔او۔اے کالج لاہور کے شعبہ ٔمعاشیات میں درس و تدریس کا انجام دیتے ہیں۔

ناصر کی تعلیم و تربیت میں ان کے والدین کا بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ناصر انتہائی ذہین اور آزاد طبیعت کے مالک تھے۔جنھیں گھومنے پھرنے ،کبوتر پالنے ،گھڑ سواری کرنے ،شعر و شاعری، موسیقی و دیگر فنون لطیفہ کا شوق بچپن سے ہی تھا۔نو عمری میں ہی وہ گلستان،بوستان،قصہ چہاردرویش اورالف لیلہ اور کئی دیگر کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔انہوں نے اردودواور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔اس کے بعد اپنی والدہ کی نگرانی میں پانچویں جماعت تک کی تعلیم مشن گرلز اسکول سے حاصل کی اور میٹرک کی تعلیم مسلم ہائی اسکول انبالہ سے مکمل کی بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔بی ،اے کی ڈگری ابھی حاصل نہ کی تھی کہ تقسیم ہند کا معاملہ عمل میں آیا اور ان کا خاندان ہجرت کرکے پاکستان چلا گیا۔ تقسیم سے پیداہوئی بد امنی اور ہجرت کے کرب نے ناصر کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔پاکستان پہنچ کر انھوں نے بہت سی مصیبتیں اٹھائیں بالآخر جب حالات سازگارہوئے تو تلاش معاش میں سرگرداں ہوئے آخرکار

1950 میں 'اوراق نو' کے مدیر ہوئے ابھی ایک ہی برس گزرا تھا کہ 1951 میں ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی۔بعد ازاں 1952 میں رسالہ 'ہمایوں' میں جوائنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔اسی طرح یکے بعد دیگرے ملازمتوں کا سلسہ چلتا رہا اورآخر میں اگست 1964 کو ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہونے کے بعد اسی سے جڑے رہے۔انھیں پائیلٹ بننے کا بھی شوق تھا جس کے لیے انھوں نے Royal Indian Air Force (R.I.A.F)کا بھی امتحان دیا۔اس امتحان میں وہ کامیاب تو ہوئے لیکن میڈکل جانچ میں فیل ہونے کی وجہ سے یہ خواب ادھورا ہی رہ گیا۔آخر وقت میں پیٹ کے کینسر کی وجہ سے طبیعت خراب رہنے لگی ۔البرٹ وکٹر ہسپتال میں کئی ماہ زیر علاج رہنے کے بعد بالآخر2 مارچ1972 کو انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

ناصر کاظمی کے تین غزلوں کے مجموعے ایک نظموں کا مجموعہ ایک منظوم ڈرامااور ایک مضامین کا مجموعہ شائع ہواہے۔"برگ نے" ان کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی بار 1952 میں لاہور کے مکتبہ ٔکارواں سے شائع ہوا تھا۔اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔دوسرا مجموعہ "دیوان"1972 میں شائع ہوا۔تیسرا مجموعہ" پہلی بارش" 1975اور نظموں کا مجموعہ" نشاط خواب " 1977 میں شائع ہوا۔دوسرے مجموعے میں ناصرکاظمی کا کلام منفرد نظر آتا ہے۔جہاں رومانویت کے بجائے پختگی نظر آتی ہے۔منظوم ڈراما"سُر کی چھایا"1981 میں شائع ہوا۔مضامین کا مجموعہ "خشک چشمے کے کنارے" 1982 میں شائع ہوا۔علاوہ ازیں انھوں نے بہت سے شعرا کے کلام کاانتخاب کرکے اسے بھی شائع کرایا، جس میں انتخاب میرؔ(1989)،انتخاب نظیرؔ(1990)، انتخاب ولیؔ (1991) اور انتخاب انشاءؔ(1991)خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

10.3.2ناصر کاظمی کی غزل گوئی:

ناصر کاظمی کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات نے انھیں متاثر تو کیا لیکن شاعری پر اس کے اثرات کم کم ہی نظر آتے ہیں۔انھوں نے خارجی زندگی کے مشاہدات کو تخیلات کے سانچے میں پرو کراپنی غزلوں میں پیش کیاہے۔جس کے نتیجے میں ان کی شاعری کی فضا میں جذباتیت، جمالیات، فکر اور خوابناک کیفیت نظر آتی ہے۔ان کی شاعری میں بنیادی طور پر عشق کے جذبے سے معمور ہے لیکن محبوب کے قرب سے محرومی کااظہار جا بجادیکھا جا سکتا ہے۔ان کا عشق ہجرو وصال کے دائرے میں مقید نہ ہو کر انسانی رشتوں کی سچائی،دل آویزی اور جذبہ کشش کے ساتھ شکستہ دلی کے سوز وساز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ان کی عشقیہ شاعری ہوس پرستی سے پاک ہے۔جس کی وجہ سے شعر کا جمالیاتی تجربہ محبوب کے حسن و جمال کوایک مخصوص رنگ عطا کرتا ہے۔شعر ملاحظہ ہو:

آنکھ کھلی تو تجھے نہ پاکر　　میں کتنا بے چین ہوا تھا

یاد کے بے نشاں جزیروں سے　　تیر ی آواز آ رہی ہے ابھی

ناصر کاظمی کا شعری اسلوب جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ان کے اشعار کی سادگی ،برجستگی اور شگفتگی ان کے

تجربات کو شعری پیکر میں ڈھال کر تازگی کا احساس دلاتی ہے۔بالخصوص ان کی غزل کے ا شعار میں جو ملائمت ،دھیماپن اور سوز وگداز پایا جاتا ہے ، وہ انہیں کلاسیکی غزل گو شعرا کے قریب کرتا ہے۔جس میں میرؔ سے وہ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔کلاسیکی انداز کے ساتھ ساتھ ان کے شعروں میں جدت نگا ری اور کفایت لفظی کا بہترین استعمال بھی ملتا ہے، جن سے وہ اپنی غزلوں کو مزین کرتے ہیں۔

آ ج کی رات نہ سونا یارو آج ہم ساتواں در کھولیں گے
اس بستی سے آتی ہیں آوازیں زنجیروں کی

اس کے ساتھ ساتھ ناصر کاظمی کی غزلوں میں داستانوی فضا بھی پائی جاتی ہے ، جس میں اشعار اپنی رمزیت ، اسراریت اور تحیر خیزی کے ساتھ دلکشی پیدا کرتے ہیں۔

سو گئے لوگ اس حویلی کے ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
سرخ چناروں کے جنگل میں پتھر کا ایک شہر بسا تھا

ناصر کاظمی پیکر تراشی، لفظوں اور استعاروں کے بر محل استعمال اور اس کی قدرو قیمت سے بخوبی واقف تھے ۔وہ روز مرہ استعمال ہونے والے الفاظ کو مناسب ترتیب دے کر اسے شعر میں یوں پیش کرتے ہیں کہ اس سے ان کا انفرادی اسلوب نمایاں ہو جاتا ہے۔علاوہ ازیں ان کی شاعری میں ماضی کے حسین لمحات پرانی صحبتیں، ملاقاتیں ،درد و کرب اور احساس محرومی سے معمور شدید جذبات کی جھنکار بھی صاف سنائی دیتی ہے۔

10.3.3غزل: (متن)

کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے
ہوا کہیں کی ہو سینہ فگار اپنا ہے
ہو کوئی فصل مگر زخم کھل ہی جاتے ہیں
سدا بہار دل داغدار اپنا ہے
بلا سے ہم نہ پئیں مے کدہ تو گرم ہوا
بقدر تشنگی رنج خمار اپنا ہے
جو شاد پھرتے تھے کل آج چھپ کے روتے ہیں
ہزار شکر کہ غم پائیدار اپنا ہے
اسی لیے یہاں کچھ لوگ ہم سے جلتے ہیں
کہ جی جلانے میں کیوں اختیار اپنا ہے

نہ تنگ کر دل محزوں کو اے غم دنیا
خدائی بھر میں یہی غم گسار اپنا ہے
کہیں ملا تو کسی دن منا ہی لیں گے اسے
وہ زود رنج سہی پھر بھی یار اپنا ہے
وہ کوئی اپنے سوا ہو تو اس کا شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے
نہ ڈھونڈھ ناصرؔ آشفتہ حال کو گھر میں
وہ بوئے گل کی طرح بے قرار اپنا ہے

10.3.4 تشریح:

کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے
ہوا کہیں کی ہو سینہ فگار اپنا ہے

غزل کے پہلے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ چاہے درد کسی اور کا ہو، مگر اس کا اثر میرے دل پر بھی ہوتا ہے اور وہ بے قرار ہو جاتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر دوسروں کے دکھ کو بھی شدت سے محسوس کرتا ہے۔یعنی اس کا دل اتنا حساس ہے کہ وہ دوسروں کے دکھ درد کو بھی اپنا سمجھتا ہے۔

ہو کوئی فصل مگر زخم کھل ہی جاتے ہیں
سدا بہار دل داغدار اپنا ہے

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ زندگی میں چاہے کوئی بھی وقت ہو،خوشی ہو یا غم،اس کا دل ہمیشہ زخموں سے بھرا رہتا ہے۔ہر موسم میں پرانے زخم تازہ ہو جاتے ہیں، اور دل ہر حال میں داغداررہتا ہے، جیسے وہ سدا بہار درخت ہو جو ہر وقت ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔

بلا سے ہم نہ پئیں مے کدہ تو گرم ہوا
بقدر تشنگی رنج خمار اپنا ہے

شاعر کہتا ہے کہ اگر ہم شراب نہ بھی پئیں تو کوئی پروا ہ نہیں، کیونکہ مے کدہ میں تو گہما گہمی ہے، مے کدہ تو آباد ہے۔ہمیں تو اپنی پیاس کے مطابق جو درد کا خمار ملا ہے، وہی ہمارا اپنا ہے۔یعنی ہم نے غموں سے جو نشہ پایا، وہی ہمارے لیے کافی ہے۔

جو شاد پھرتے تھے کل آج چھپ کے روتے ہیں
ہزار شکر کہ غم پائیدار اپنا ہے

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ جو لوگ کل تک خوشیاں مناتے تھے، آج چھپ کر روتے ہیں۔اس کے برعکس، شاعر اپنے پر ٹوٹنے والے مسلسل غموں کا شکر ادا کرتا ہے کہ کم از کم اس کا غم پائیدار اور سچا تو ہے۔وہ خوشی اور مسرت کی طرح وقتی ناپائیدار اور بے وفا نہیں کہ آج ہے کل نہیں ہے۔مطلب یہ دنیا میں خوشیاں کم اور غم بہت زیادہ ہیں اس لیے خوشی آنے پر اترانا اور غم ملنے پر گھبرانا نہیں چاہیے۔

اسی لیے یہاں کچھ لوگ ہم سے جلتے ہیں
کہ جی جلانے میں کیوں اختیار اپنا ہے

شاعر کہتا ہے کہ کچھ لوگ اس سے اس لیے حسد کرتے ہیں کہ وہ اپنے دل کو جلانے کا اختیار رکھتا ہے۔یعنی وہ اپنے غم کو اپنے انداز سے جیتا ہے اور یہ خود مختاری لوگوں کو چبھتی ہے۔

نہ تنگ کر دل محزوں کو اے غم دنیا
خدائی بھر میں یہی غم گسار اپنا ہے

اس شعر میں شاعر دنیا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے دنیا! میرے غمگین دل کو مزید نہ ستا، کیونکہ پوری دنیا میں یہی ایک دل ہے، جو میرا سچا غم گسار ہے۔یعنی یہی دل ہے جو میرا ساتھ دیتا ہے،باقی دنیا نے مجھے صرف دکھ دیے۔

کہیں ملا تو کسی دن منا ہی لیں گے اسے
وہ زود رنج سہی پھر بھی یار اپنا ہے

اس شعر میں شاعر اپنے محبوب کی ناراضگی کا ذکر کر رہا ہے۔کہتا ہے کہ اس کا محبوب سے جلد رنجیدہ ہو جاتا ہے، لیکن پھر یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اپنا یار ہے۔شاعر پرامید ہے کہ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو وہ اسے منا لے گا۔یعنی ناراضگی کے باوجود رشتہ قائم ہے، اور یہ رشتہ بہت قیمتی ہے۔

وہ کوئی اپنے سوا ہو تو اس کا شکوہ کروں
جدائی اپنی ہے اور انتظار اپنا ہے

شاعر کہتا ہے کہ جدائی بھی اپنی ہے، انتظار بھی اپنا ہے،تو کس سے شکایت کروں؟یعنی محبوب بھی اپنا، اور اس کی دوری کا درد بھی اپنا۔تو پھر شکایت کیسی؟ یہ تو اپنے نصیب کی بات ہے۔

نہ ڈھونڈھ ناصرؔ آشفتہ حال کو گھر میں
وہ بوئے گل کی طرح بے قرار اپنا ہے

یہ شعر غزل کا مقطع ہے۔اس شعر میں ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ مجھے گھر میں مت تلاش کرو۔میں اس خوشبو کی مانند ہوں جو ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتی، بلکہ ہر طرف بکھری رہتی ہے۔یعنی شاعر بے قرار، مضطرب اور آوارہ گرد ہے۔یہ شعر ناصر کاظمی نے اپنے حسب حال کہا ہے۔انہیں پیدل چلنے اور کوچہ گردی کی عادت تھی۔وہ گھر میں بہت کم رہتے تھے۔

مشکل الفاظ:

سینہ فگار	زخمی سینہ، دل کا چھلنی ہونا	Wounded chest, Pierced Heart
مے کدہ	شراب خانہ	Tavern, Wine house
تشنگی	پیاس	Thirst
رنج خمار	نشے کے بعد کی تکلیف یا اداسی	Sorrow after intoxication, hangover sadness
غم پائیدار	مستقل غم، نہ ختم ہونے والا غم	Persistent grief, Lasting sorrow
دل محزوں	غمگین دل، اداس دل	Sad heart, Sorrowful heart
غم گسار	دکھ درد بانٹنے والا، ہمدرد	Sympathizer, one who shares others' sorrow
زود رنج	جلد ناراض ہونے والا	Easily offended, quick-tempered
آشفتہ حال	پریشان حال، بے حال	Distressed, troubled
بے قرار	جسے سکون نہ ہو، مضطرب	Restless, anxious

مشق 1: دیے گئے لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ زخم ....

2۔ تشنگی ....

3۔ خدائی ....

4۔ رنج ....

5۔ جدائی ....

مشق 2: درج ذیل مصرعوں کو مکمل کیجیے۔

1۔ کسی کا درد ہو دل...............................

2۔ ....زخم کھل ہی جاتے ہیں

3۔ ....مے کدہ تو گرم ہوا

4۔ نہ ڈھونڈھ ناصرؔ................................

5۔ وہ زود رنج سہی................................

10.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- فراق گورکھپوری 28 اگست 1896 کو گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام رگھوپتی سہائے اور تخلص فراقؔ تھا۔ ان کے

والد منشی گورکھ پرساد عبرت بھی شاعر تھے۔ فراق کا شمار اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔

- فراق نے انگریزی سے ایم۔اے کیا اور اس کے بعد 1930 میں الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہو گئے۔ طویل علالت کے بعد 1982 میں پچاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔
- فراق کی غزلوں کا عام موضوع حسن و عشق ہے لیکن انہوں نے اجتماعی مسائل، سماج کے مشترکہ اقدار اور معاملات پر بھی کھل کر اظہار خیال کیا ہے۔
- فراق کی غزلوں میں سماج کے مختلف پہلو اور تصویریں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے۔ وہ ایک نئے سماج اور نئے نظام کی تشکیل کے خواب دیکھتے ہیں۔
- فراق کا انداز بہت دلکش ہے۔ اسلوب منفرد اور موثر ہے۔ فراق کی غزلوں میں موضوع کے اعتبار سے بھی کافی تنوع نظر آتا ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات کو اپنے مخصوص لہجے میں انتہائی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔
- ناصر کاظمی کا اصل نام سید ناصر رضا کاظمی اور تخلص ناصر تھا۔ وہ ہریانہ میں 8/ دسمبر 1925 کو پیدا ہوئے۔
- ناصر کاظمی کے دادا سید شریف الحسن پولیس انسپکٹر تھے اور والد محمد سلطان کاظمی رائل انڈین آرمی میں صوبیدار میجر کے عہدے پر فائز تھے۔
- ناصر کاظمی کی تعلیم و تربیت میں ان کے والدین کا بہت ہی اہم رول رہا ہے۔ ناصر انتہائی ذہین اور آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ نو عمری میں ہی انھوں نے گلستان، بوستان، قصہ چہاردرویش اورالف لیلیٰ اور کئی دیگر کتابوں کا مطالعہ کر چکے تھے۔ انہوں نے اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔
- ناصر کاظمی کے تین غزلوں کے مجموعے ایک نظموں کا مجموعہ ایک منظوم ڈراما اور ایک مضامین کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ”برگ نے“ ان کا پہلا مجموعہ ہے جو پہلی بار 1952 میں لاہور کے مکتبۂ کارواں سے شائع ہوا۔
- ناصر کاظمی کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و واقعات نے انھیں متاثر تو کیا لیکن شاعری پر اس کے اثرات کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے خارجی زندگی کے مشاہدات کو تخیلات کے سانچے میں پرو کر اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔
- ناصر کاظمی پیکر تراشی، لفظوں اور استعاروں کے بر محل استعمال اور اس کی قدرو قیمت سے بخوبی واقف تھے۔ روز مرہ استعمال ہونے والے الفاظ کو مناسب ترتیب دے کر اسے یوں شعر میں پیش کرتے ہیں کہ اس سے ان کا انفرادی اسلوب نمایاں ہو جاتا ہے۔

10.5 نمونہ امتحانی سوالات

10.5.1 معروضی سوالات:

1۔ فراق گورکھپوری کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(a) 1896 (b) 1898 (c) 1894 (d) 1892

2۔ فراق گورکھپوری کا اصل نام کیا تھا؟

(a)گورکھ پرساد (b)دھنپت رائے (c)رگھوپتی سہائے (d)نواب رائے

3۔ فراق گورکھپوری الہ آباد یونیورسٹی میں کس شعبے میں لکچر رتھے ؟

(a)انگریزی (b)ہندی (c)اردو (d)فارسی

4۔ ان میں سے کون سی کتاب فراق گورکھپوری کی شعری تخلیق ہے؟

(a)اردوغزل گوئی (b)حاشیے (c)روح کائنات (d)اردوغزل گوئی

5۔ ذیل کے کس شعری مجموعے پر فراق کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا؟

(a)غزلستان (b)گل نغمہ (c)نغمہ نما (d)شعرستان

6۔ ناصر کاظمی کی پیدائش کس صوبے میں ہوئی ؟

(a)پنجاب (b)دہلی (c)اترپردیش (d)ہریانہ

7۔ ناصر کاظمی کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(a) 1925 (b)1930 (c)1932 (d)1935

8۔ ناصر کاظمی کی والدہ کا کیانام تھا؟

(a)منیرہ محمدی (b)کنیزہ محمدی (c)فریدہ محمدی (d)زرینہ محمدی

9۔ ناصر کاظمی کے داد سید شریف الحسن کس پیشے سے وابستہ تھے؟

(a) منشی (b)وکالت (c)پولیس (d)ڈاکٹر

10۔ ذیل کا کون سا شعری مجموعہ ناصر کاظمی کا نہیں ہے ؟

(a)روپ (b)برگ نے (c)دیوان (d)پہلی بارش

10.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فراق گورکھپوری کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟لکھیے۔

2۔ فراق گورکھپوری کی تخلیقات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ ناصر کاظمی کا تعارف پیش کیجیے۔

4۔ ناصر کاظمی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

5۔ درج ذیل شعر کی تشریح کیجیے۔

جسے صورت بتاتے ہیں پتہ دیتی ہے سیرت کا
عبارت دیکھ کر جس طرح معنی جان لیتے ہیں

10.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ فراق گورکھپوری کی غزل گوئی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

2۔ ناصر کاظمی کی غزل گوئی پر تبصرہ کیجیے۔

3۔ درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

کسی کا درد ہو دل بے قرار اپنا ہے
ہوا کہیں کی ہو سینہ فگار اپنا ہے
ہو کوئی فصل مگر زخم کھل ہی جاتے ہیں
سدا بہار دل داغدار اپنا ہے

10.5.1 کے جوابات:

B (v)	C (iv)	A (iii)	C (ii)	A (i)
A (x)	C (ix)	B (viii)	A (vii)	D (vi)

اکائی 11: غزل
مغنی تبسم، شہریار

اکائی کے اجزا

11.0		تمہید
11.1		مقاصد
11.2		مغنی تبسم
	11.2.1	مغنی تبسم کا تعارف
	11.2.2	مغنی تبسم کی غزل گوئی
	11.2.3	غزل: (متن)
	11.2.4	تشریح
11.3		شہریار
	11.3.1	شہریار کا تعارف
	11.3.2	شہریار کی غزل گوئی
	11.3.3	غزل:(متن)
	11.3.4	تشریح
11.4		اکتسابی نتائج
11.5		نمونہ امتحانی سوالات

11.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے جدید غزل کے ممتاز شاعروں فراق گورکھپوری اور ناصر کاظمی کی غزل گوئی اور ان کی ایک ایک غزل کی قرأت کے ساتھ ان کی تشریح کا بھی مطالعہ کیا۔اس اکائی میں ہم اردو غزل کے دو نمایاں شاعروں ''مغنی تبسم'' اور ''شہریار'' کی ایک ایک غزل کو پڑھیں گے اور ان کی تشریح کے ذریعے ان کے فکری و فنی پہلوؤں کا مطالعہ کریں گے، تاکہ جدید اردو غزل کے ان دو نمایاں شعرا کی انفرادیت کو بہ آسانی سمجھا جا سکے۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- مغنی تبسم کا تعارف پیش کر سکیں۔
- مغنی تبسم کی غزل گوئی پر تبصرہ کر سکیں۔
- مغنی تبسم کی غزل کی تشریح کر سکیں۔
- شہریار کا تعارف پیش کر سکیں۔
- شہریار کی غزل گوئی پر تبصرہ کر سکیں۔
- شہریار کی غزل کی تشریح کر سکیں۔

11.2 مغنی تبسم

11.2.1 مغنی تبسم کا تعارف:

پروفیسر مغنی تبسم اردو کی علمی و ادبی دنیا کی ایک مشہور و معروف شخصیت تھے۔انہوں نے شاعری، نثر، تحقیق و تنقید اور تدریس و صحافت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور ہر شعبے میں اپنی ذہانت، علمیت اور تخلیقیت کے روشن نقوش چھوڑے۔ اردو میں اسلوبیاتی تنقید کے بنیاد گزاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

مغنی تبسم کا اصل نام محمد عبدالمغنی تھا۔ وہ 13 جون 1930 کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد عبدالغنی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ مغنی تبسم نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد اور حیدرآباد کے آس پاس کے اضلاع کے مختلف مدرسوں میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان فارسی اور معاشیات کے مضامین کے ساتھ 1948 میں دارالعلوم کالج حیدرآباد سے کامیاب کیا۔ بی۔ اے کی سند 1950 میں جامعہ عثمانیہ سے حاصل کی۔ اسی یونیورسٹی سے 1952 میں اردو سے ایم۔اے کیا۔ پھر پروفیسر مسعود حسن خاں کی رہنمائی میں "فانی بدایونی: حیات، شخصیت اور شاعری" کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی۔ کی سند حاصل کی۔ انہوں نے فارسی میں بھی ایم۔ اے کیا۔ مغنی تبسم نے ابتدا میں کچھ عرصہ اکاونٹینٹ جنرل آفس میں اپر گریڈ کلرک کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر حیدرآباد کے مختلف کالجوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ 1957 میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت لکچرر ان کا تقرر عمل میں آیا، جہاں وہ 1983 میں پروفیسر اور 1988 میں صدر شعبہ اردو بنائے گئے۔ 30 جون 1990 کو وہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے اور 15 فروری 2012 کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔

مغنی تبسم نے حیدرآباد کی علمی، ادبی اور تہذیبی سرگرمیوں میں نہایت متحرک اور فعال کردار ادا کیا۔ وہ حیدرآباد کی مختلف ادبی انجمنوں، اداروں اور تحریکوں سے وابستہ تھے۔ وہ ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد کے معتمد اور اس ادارے کے ترجمان ماہنامہ "سب رس" کے مدیر رہے۔ اس کے علاوہ ساہتیہ اکادمی (دہلی) کی اردو کمیٹی کے رکن، آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے بورڈ آف گورنرس کے رکن، حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے صدر، ایچ۔ای۔ ایچ۔ دی نظامس اردو ٹرسٹ کی مختلف کمیٹیوں کے رکن، اردو مجلس کے معتمد ادبی اور اقبال اکیڈمی کے رکن رہے۔

پروفیسر مغنی تبسم کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ممتاز نقاد، محقق، خوش فکر شاعر، صاحب نظر دانشور، ماہر مترجم، باشعور مدیر اور ادبی صحافی تھے۔ انہوں نے "شعر و حکمت" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا تھا، جس کا ہر شمارہ مواد اور معیار کے اعتبار سے سے نہایت بلند پایہ اور ضخیم ہوتا تھا۔ علاوہ وہ ازیں دیگر کئی رسائل سے وابستہ تھے، جن میں مشہور ادبی رسالے "سوغات" (بنگلور) کے علاوہ ماہنامہ "صبا" (حیدرآباد) "شعور" اور "شبستان ادب" جیسے رسائل شامل ہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم نے متعدد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ان کی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

شعری مجموعے: نوائے تلخ، پہلی کرن کا بوجھ، مٹی مٹی میرا دل، درد کے خیمے کے آس پاس۔

تنقید و تحقیق: فانی بدایونی: حیات، شخصیت اور شاعری، بازیافت، آواز اور آدمی، لفظوں سے آگے، زبان و ادب، تحسین شعر، بساط نقد۔

ترتیب و تالیف: نذر فانی بدایونی، فانی کی نادر تحریریں، فکر اقبال، کہانیاں، انگریزی میں معاصر ہندوستانی کہانیاں، عصری ہندوستانی کہانیاں، دکنی لغت، ہندوستانی کہانیاں۔

ترجمے: کہانی اور اس کا فن، شادی کی آخری سال گرہ۔

پروفیسر مغنی تبسم اردو زبان و ادب کی ترقی، تحفظ اور فروغ کے لیے ہمیشہ فکر مند اور کوشاں رہتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے علاوہ لندن اور امریکہ کی مختلف جامعات میں توسیعی خطبات دیے۔ وہ سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں وزٹنگ پروفیسر بھی رہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ بی۔ بی۔ سی۔ (لندن) سے بھی ان کی گفتگو اور کلام نشر کیا گیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات اور شاعری کے اعتراف میں انہیں عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ دوحہ۔ قطر سے سرفراز کیا گیا۔ غالب اکیڈمی، دہلی نے انہیں غالب ایوارڈ اور مہاراشٹرا اردو اکیڈمی نے ولی دکنی ایوارڈ سے نوازا۔ ان کی تصانیف پر آندھراپردیش اردو اکیڈمی، اترپردیش اردو اکیڈمی اور بہار اردو اکیڈمی نے انعامات عطا کیے۔ مجموعی خدمات پر بابل ریڈی فاونڈیشن حیدرآباد اور پوٹی سری راملو تلگو یونیورسٹی حیدرآباد نے خصوصی ایوارڈ سے سرفراز کیا۔

11.2.2 مغنی تبسم کی غزل گوئی:

مغنی تبسم جتنے بلند پایہ نقاد تھے، شاعری میں بھی اتنے ہی اونچے مقام کے حامل تھے۔ ان کا شمار جدید دور کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ اپنے تجربات اور فکر کی تازگی اور اسلوب و اظہار کی ندرت کی بدولت انہوں نے شاعری کی دنیا میں اپنی ایک منفرد پہچان بنائی۔

پروفیسر مغنی تبسم کو بچپن ہی سے شعر گوئی سے شغف تھا۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "نوائے تلخ" 1947 میں اس وقت شائع ہوا جب کہ ان کی عمر محض سترہ برس کی تھی۔ نوجوانی کے زمانے میں مغنی تبسم کی شاعری پر اقبال کا گہرا اثر تھا۔ ان کی اس دور کی شاعری کا ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

بھاتے نہیں مجھ کو تو یہ تہذیب کے پھندے
شاہیں ہوں، کروں گا میں پہاڑوں پہ بسیرا

اک روز گرا دے گا مرے عزم کا طوفاں
موجودہ تمدن کے خرافات کا ڈیرا

بعد کے زمانے میں دارالعلوم کالج میں ان کے اردو کے استاد عبد القیوم خاں باقیؔ نے ان سے کہا کہ اقبال کی تقلید کر کے وہ کبھی اپنا مقام نہیں بنا پائیں گے۔ انہیں اپنے طور پر شعر کہنا چاہیے اور اپنا انفرادی اسلوب بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ اقبال کی پیروی چھوڑ کر حلقہ ارباب ذوق کے شعرا کا کلام پڑھنے لگے۔ وہ میرا جی سے بہت متاثر ہوئے اور آزاد نظمیں لکھنے لگے، جو میرا جی کی ادارت میں نکلنے والے رسالے "خیال" میں شائع ہوئیں۔ میرا جی نے نہ صرف ان کی حوصلہ افزائی کی بلکہ نظم آزاد کی فنی باریکیوں سے بھی انہیں واقف کروایا۔

مغنی تبسم کا دوسرا شعری مجموعہ "پہلی کرن کا بوجھ" 1980 میں شائع ہوا۔ اس میں غزلیات کے علاوہ آزاد نظمیں، ایک سطری، دو سطری اور تین سطری مختصر نظمیں اور اشعار شامل ہیں۔ کفایت لفظی اور داخلیت کی رو مغنی تبسم کی شاعری کے امتیازی اوصاف ہیں۔ ان کے یہاں عشق کا ارضی تصور ملتا ہے، جس میں جسم اور اس کے تقاضوں کی حرارت کا بھی احساس ہوتا ہے، لیکن یہ حرارت صرف حصول لذت کا وسیلہ نہیں بلکہ اس میں جذبے کی صداقت اور روح کی ہم آہنگی بھی نظر آتی ہے۔ عشق میں کھو کر اپنے آپ کو دریافت کرنے کی آرزو ان کے اشعار میں زیریں لہروں کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ "بازداشت"، "سمندر پہ نقش کف پا"، "راگ" جیسی نظموں میں یہ کیفیت واضح اور نمایاں ہے۔ اس کیفیت کے ترجمان اس مجموعے کی غزلوں کے چند اشعار دیکھیے۔

سمندر میں اتر جانا ہے مجھ کو یہاں سے ڈوب کر جانا ہے مجھ کو
ترے دامن میں بھر جانا ہے مجھ کو تجھے اپنا سبھی کچھ سونپنا ہے
کبھی تو اپنے لہو سے بھی آزما مجھ کو کبھی تو اپنے بدن کے چراغ روشن کر

مغنی تبسم کی شاعری میں کہیں کہیں تجربے کی پر اسراریت اور تہہ داری سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ اس تہہ در تہہ معنویت اور اجنبی فضا نے نفی تبسم کے طرز احساس کو ایک انوکھے پن اور ندرت سے آشنا کیا ہے، جس کے اظہار کے لیے انہوں نے تازہ کار استعارے اور نئی زبان خلق کی ہے۔

دور جاتا ہوا دریا دیکھا پاس آتے ہوئے صحرا میں کہیں
اب مجھے اپنی ضرورت نہ رہی سونپ دی ہے اسے تنہائی بھی
جو گر پڑا تو مجھے آسماں دکھائی دیا کھڑا ہوا تھا تو دیوار و در پہ نظریں تھیں

پروفیسر مغنی تبسم کا تیسرا شعری مجموعہ "مٹی مٹی میرا دل" 1991 میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں نظموں کو شامل نہیں کیا گیا ہے۔ یہ غزلیں بلا شبہ اعلیٰ شاعری کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان میں کسی نظریے سے وابستگی نظر نہیں آتی۔ یہاں شاعر کی وابستگی اگر محسوس ہوتی ہے تو وہ اس کی اپنی ذات اور اپنے جذبات و احساسات سے ہے۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ

ادب اور تنقید کے ضمن میں مغنی تبسم نے اپنے ذہن کے دروازے نئے نئے نظریات رجحانات کے لیے ہمیشہ کھلے رکھے۔ وہ ترقی پسند بھی رہے، پھر جدیدیت سے بھی متاثر رہے اور مابعد جدیدیت کو بھی اپنے شعور و ادراک کا حصہ بنایا، لیکن اپنی شاعری کو شاعری ہی رہنے دیا۔ اس پر کسی نظریے یا رجحان کی چھاپ لگنے نہ دی، جس کا ثبوت "مٹی مٹی میرا دل" میں شامل غزلیات ہیں۔ اس مجموعے کی ہر غزل ایک مخصوص کیفیت، منفرد احساس اور خاص اسلوب بیان کی حامل ہے۔

مٹی مٹی میرا دل کی غزلوں میں فکری عنصر سے زیادہ جذبہ و احساس کی ترسیل نمایاں ہے۔ ان غزلوں میں نجی زندگی کے المناک واقعات خصوصاً عزیز ترین رفیقہ حیات کی اچانک موت کے صدمے کا اثر، ذاتی محرومی، اداسی اور تنہائی کے کرب کا احساس نہایت شدید اور گہرا ہے، لیکن جذبہ و احساس کی شدت کے باوجود ان کے اشعار میں ضبط و ٹھہراؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں رنج و الم کی شوریدگی نہیں ہے بلکہ گہری اداسی اور تنہائی کی دھیمی لہر ہے جو ہیجان خیز نہیں ہے، لیکن تہہ میں مچلتے طوفان کا پتہ ضرور دیتی ہے۔ اس کے ساتھ ان کے لہجے کی خود رفتگی اور خود کلامی کا انداز ان کے اشعار کی دلکشی اور تاثیر کو دونا کر دیتا ہے۔

یوں لگتا ہے سب کچھ کھونے آیا تھا   میں اس گھر میں تجھ کو رونے آیا تھا

میں اس کے دیدار سے کب سیراب ہوا   وہ تو بس دامن کو بھگونے آیا تھا

مٹی مٹی میرا دل   مٹی میں ہے تیرا گھر

صبا کے ساتھ گئی بوے پیرہن اس کی   زمیں کی گود میں گیسو بکھر گئے اب تو

پروفیسر شمیم حنفی کے بقول" مغنی تبسم کی شاعری کا آہنگ دھیما اور لہجہ سرگوشی کا ہے۔ یہ شاعری ہمارے احساسات کو دھیرے دھیرے منور کرتی ہے... مغنی اپنی شاعری میں جس واردات کا، دھیان کی جن ڈوبتی ابھرتی لہروں کا، جس طرح کی ذہنی کیفیت اور جذباتی کیفیتوں کا بیان کرتے ہیں وہ کبھی اپنی آمد کا اعلان نہیں کرتیں۔ یہ واردات یہ کیفیتیں چاند کی طرح زمین پر اترتی ہیں۔...ان کی آواز کبھی ایک خاص حد سے اونچی نہیں ہوتی۔ جذبات کے اثر میں آنے کے بعد بھی ان کا لہجہ جذباتیت سے آزاد رہتا ہے۔ نالہ کبھی بکھرتا نہیں اور اس کی غنایئت پر کبھی حرف نہیں آتا۔"

اب آکے کوئی رلا دے تو روشنی آئے   بہت دنوں سے لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

سر افق سے نظر لوٹ کر نہیں آئی   وہ جا چکا تھا مگر انتظار کیسا تھا

یہ حسرت ہے کہوں میں دوستوں سے   ہوئی اب شام گھر جانا ہے مجھ کو

مغنی تبسم کے اشعار میں پائی جانے والی افسردگی اور ملال کی کیفیت ان کی شاعری کا رشتہ ناصر کاظمی سے جوڑتی ہے۔ دوری اور مہجوری کا تجربہ دونوں کے یہاں شعری رویوں کی اساس اور سرچشمہ تخلیق ہے۔ مغنی تبسم کے درج اشعار ناصر کاظمی کی یاد دلاتے ہیں:

میں اپنے خوابوں کی دنیا میں کھویا رہا   کب رات ڈھلی، کب چاند بجھا معلوم نہیں

جب بھور بھئے کوئل کی صدا کانوں میں پڑی　　کیوں میرے دل میں درد اٹھا معلوم نہیں
منزل منزل تیرے کرم کے ڈیرے ہیں　　تپتی دھوپ میں دشت رواں ہیں میرے بھی

مٹی مٹی میرا دل کی غزلیات نے صنف غزل کی مرکزی روایت میں اداسی، محرومی، بے حصولی اور ناکامی کے تجربے کو شدت اور گہرائی کے ساتھ داخل کیا ہے، جس کے سبب غزلیہ شاعری کی عشقیہ واردات میں ایک نئی جہت اور ایک نئے رنگ و آہنگ کا اضافہ ہوا ہے۔ مغنی تبسم کی غزلوں میں غم واندوہ، بے بسی، بے چارگی اور ذاتی تجربے کی آنچ بہت تیز ہے، لیکن اس کا موضوع ہجر و وصال کی شخصی واردات تک محدود نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی رنج و ملال اور محرومی کے دکھ میں شائستگی اور وقار کا رنگ شامل کر کے غم کے تزکیے کی صورت پیدا کی ہے۔

مغنی تبسم کی شاعری کی ایک امتیازی خصوصیت ان کی خوب صورت اور پر اثر امیجری یا پیکر تراشی ہے۔ انہوں نے خارجی دنیا خصوصاً مظاہر قدرت سے اپنی امیجری وضع کی ہے۔ پیکر تراشی کے ساتھ ساتھ مختلف ذہنی اور جذباتی کیفیت کی ترسیل اور فضاسازی کے لیے انہوں نے ایک مخصوص استعاراتی زبان خلق کی ہے۔ مثلاً ذیل کے اشعار دیکھیے جن میں استعارہ سازی کی ندرت اور چونکانے والی امیجری نے مغنی تبسم کی غزل کو ایک انفرادی شناخت عطا کی ہے۔

ایک اک پیڑ اکھڑتا دیکھا　　زور جنگل میں ہوا کا دیکھا
چاند ابھی تو نکلا ہی تھا کیسے ڈوب گیا　　میرے آنگن میں یہ کالی رات کہاں سے آئی
اس بستی میں کتنے گھر مٹی کے ہیں　　بادل ٹوٹ کے برسے گا تو دیکھیں گے
آسماں پر ہے عجب چاند ستاروں کا سماں　　دل میں دیکھو تو یہاں رات کا منظر ہے الگ

مغنی تبسم کی غزلوں میں جذبہ، احساس، فکر، لفظ، بیان اور دیگر لوازمات شعر گھل مل کر ایسی ناقابل تقسیم وحدت میں ڈھل گئے ہیں، جس کے بطن سے سچی شاعری پھوٹتی ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک ایسی فضا کا احساس ہوتا ہے، جس میں ضبط غم اور تہذیب جذبات تخلیق کار کی ذات کا پردہ بن کر اس فضا کو پر اسرار اور دلکش بنادیتے ہیں۔

مغنی تبسم کا چوتھا شعری مجموعہ "درد کے خیمے کے آس پاس" 2002 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا عنوان مغنی تبسم کے جگری دوست شہریار کا دیا ہوا ہے، جو انہوں نے مجموعے میں شامل اس شعر سے لیا ہے۔

اڑتی ہے راکھ درد کے خیمے کے آس پاس
تنہائیوں کی آگ میں جلنے لگا ہے کچھ

اس مجموعے میں "پہلی کرن کا بوجھ" اور "مٹی مٹی میرا دل" میں شامل کلام کے علاوہ ان مجموعوں میں غیر مشمولہ کلام کا انتخاب بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح اسے مغنی تبسم کی شاعری کی کلیات کہا جاسکتا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی مغنی تبسم کی غزلیہ شاعری کو خالص شاعری کا دلکش نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ اس میں کسی خاص فکر و فلسفے یا مخصوص نظریے کی چھوٹ یا کار فرمائی نظر نہیں آتی۔ یہ

خالص جذبہ واحساس کی شاعری ہے، جس کا منبع و سرچشمہ شخصی تجربات، ذاتی محرومی، اداسی، تنہائی اور سوگواری ہے، جس کے اظہار میں مغنی تبسم نے نہایت ہنرمندی اور فن کاری کے ساتھ تعمیم کا رنگ بھر دیا ہے، جس کی بدولت ان کے اشعار عام قارئین کے جذبات و احساسات کی تصویر بن گئے ہیں۔

11.2.3 غزل: (متن)

اک عہدِ وصال چار سو ہے — اور دردِ فراق کو بہ کو ہے
یوں دیکھ رہا ہوں آسماں کو — بادل کے عقب میں جیسے تو ہے
خوشبوئے بدن ہے پھول میں سب — مٹی میں بسا ہوا لہو ہے
جو سو نہ سکے وہ آنکھ ہوں میں — جو ٹوٹ گئی وہ نیند تو ہے
رستہ ہے سخن کا بند تجھ سے — اب اپنے خدا سے گفتگو ہے
میں سوچ رہا ہوں، تو نہیں ہے — میں دیکھ رہا ہوں اور تو ہے
آئینہ، خیال بن گیا ہے — ایک چہرہ یقین کا رو برو ہے
تو میرے وجود کا تقاضہ — تو میرے عدم کی آبرو ہے
ہے دست دعا ہوا کا جھونکا — ہر پھول میں رنگ آرزو ہے
دنیا کے سوال سارے مجھ پر — چپ ہوں کہ مرا جواب تو ہے

11.2.4 تشریح:

اک عہدِ وصال چار سو ہے — اور دردِ فراق کو بہ کو ہے

یہ شعر غزل کا مطلع ہے، جس کے دونوں مصرعوں میں قافیہ کی پابندی کی گئی ہے۔اس شعر کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ دنیا میں چاروں طرف وصال یعنی محبوب سے ملنے اور اس کے قرب کی مسرت کا دور چل رہا ہے جس کے نتیجے میں فراق یعنی محبوب سے جدائی کا درد آوارہ اور بے سہارا ہو گیا ہے اور گلی کوچوں میں بھٹک رہا ہے۔ دوسرا مفہوم ہے کہ ساری دنیا تو وصال کی خوشی میں سرشار ہے اور ایک ہم ہیں کہ فراق کا درد لیے کوچہ بہ کوچہ بھٹک رہے ہیں۔

ایک اور مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں ہر طرف محبوب کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ گویا ہر جگہ محبوب کے حسن و جمال کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وصال سے مراد محبوب (خدا) کے جلال و جمال اور قدرت و کمال کا مشاہدہ ہے۔ کائنات کی کوئی شئے اس کے نور اور قدرت سے باہر نہیں، لیکن اس قربت کے باوجود وہ ہر شئے سے جدا اور الگ ہے۔ گویا کہ ہر شئے اس سے فراق کے عالم میں ہے۔ وصال اور فراق کے تضاد کو اس شعر میں بڑی خوب صورتی سے ابھارا گیا ہے۔

یو دیکھ رہا ہوں آسماں کو　　　بادل کے عقب میں جیسے تو ہے

اس شعر سے بھی دو مطلب اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ایک تو یہ کہ عام تصور کے مطابق خدا آسمان میں ہے۔اس لیے مصیبت میں انسان آسمان کی طرف دیکھ کر خدا کو پکارتا ہے۔خدا کو "اوپر والا" بھی کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ خدا تو ہر جگہ موجود ہے۔اس شعر میں ایک خاص کیفیت کا ذکر ہے۔شاعر آسمان کی طرف اس طرح تک رہا ہے جیسے بادلوں کے پیچھے خدا ہے اور جب بادل ہٹیں گے تو وہ اسے دیکھ لے گا۔

اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ عام عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد انسان آسمانی دنیا میں چلا جاتا ہے۔شاعر کی کسی عزیز ہستی یا محبوب کا انتقال ہو گیا ہے۔اب وہ اس کو دیکھ نہیں سکتا، لیکن جب اس کی یاد ستانے لگتی ہے تو وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔اس کے لاشعور میں یہ خیال بسا ہوا ہے کہ اس کا محبوب آسمان میں بادلوں کے پیچھے ہے، شاید کبھی اس کا چہرہ نظر آجائے۔

خوشبوئے بدن ہے پھول میں سب　　　مٹی میں بسا ہوا لہو ہے

اس شعر میں یہ کہا گیا ہے کہ پھولوں میں جو خوشبو ہے وہ محبوب کے بدن کی ہے۔اس شعر میں پہلے شعر کے خیال کی توسیع ہے۔ محبوب جو نہایت حسین و جمیل تھا اور ہمیشہ خوشبوؤں میں مہکتا رہتا تھا، وفات پا چکا ہے۔ اس کا مہکتا ہوا پیکر قبر میں دفن ہے، لیکن اس کے بدن کی مہک مٹی میں مل کر پودوں کی غذا بن گئی ہے۔اس لیے پودوں میں جو پھول لگے ہیں، ان میں محبوب کے بدن کی خوشبو ہے۔

جو سو نہ سکے وہ آنکھ ہوں میں　　　جو ٹوٹ گئی وہ نیند تو ہے

محبوب کی جدائی کے سبب عاشق کو رات بھر نیند نہیں آتی۔ وہ راتوں میں جاگتا رہتا ہے، کیوں کہ محبوب کی یادیں اسے سونے نہیں دیتیں۔اس کی حالت اس آنکھ کی سی ہے جو سو ہی نہیں سکتی، جسے ہمیشہ کے لیے نیند سے محروم کر دیا گیا ہے۔اس کے لیے محبوب کا وجود نیند کی مانند تھا، جو سکون بھی دیتی اور راحت بھی پہنچاتی ہے، لیکن موت نے اس کے محبوب کو اس سے چھین لیا ہے اور وہ دائمی طور پر اس سے جدا ہو گیا ہے۔اب محبوب کا وجود ایک ایسی نیند کی طرح ہے جو ٹوٹ گئی ہے، دوبارہ نہیں آئے گی۔اس طرح محبوب کے ساتھ عاشق کی لذتِ خواب یا نیند کی راحت بھی چھن گئی ہے۔

رستہ ہے سخن کا بند تجھ سے　　　اب اپنے خدا سے گفتگو ہے

عاشق اور معشوق کے درمیان کوئی دیوار حائل ہے۔یہ دیوار جدائی کی بھی ہو سکتی ہے اور موت کی بھی۔ اس لیے عاشق اب معشوق سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ دونوں میں بات چیت کا راستہ بند ہے۔ معشوق سے دوبارہ رابطے اور بات چیت کے امکانات ختم ہو گئے ہیں۔اس لیے غم اور مایوسی کی حالت میں عاشق نے خدا سے تعلق جوڑ لیا ہے۔ محبوب کو تو نہیں سنا سکتا خدا کو اپنا دردِ دل سناتا ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا کو چھوڑ کر خدا کی عبادت میں لگ گیا ہے۔

میں سوچ رہا ہوں، تو نہیں ہے   میں دیکھ رہا ہوں اور تو ہے

اس شعر میں ہوش مندی اور بے خودی کی ایک عجیب کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔ اسے ذہن اور دل کی دو متضاد کیفیتوں سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ذہن اور عقل کا ماننا ہے کہ محبوب کی ہستی اب ہمیشہ کے لیے جدا ہو چکی ہے، لیکن دل میں اس کی یادوں کا طوفان ہے۔ وہ تصور میں اسے چلتا پھرتا دیکھ رہا ہے۔ دماغ کہتا ہے کہ محبوب اب نہیں ہے، لیکن جذبات کا عالم یہ ہے کہ عاشق اسے اپنی یادوں میں دیکھ رہا ہے۔

آئینہ، خیال بن گیا ہے   ایک چہرہ یقین کا رو برو ہے

آئینے میں کسی شئے کا خیال یا عکس نظر آتا ہے، جو حقیقی وجود نہیں رکھتا۔ اصل شئے آئینے کے باہر اس کے مقابل یا روبرو ہوتی ہے، لیکن کسی کی یاد کی شدت ایسی ہے کہ خیالات خود آئینہ بن گئے ہیں، جس میں محبوب کا چہرہ حقیقت یا یقین بن کر اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ خیال یا یاد کو آئینہ قرار دینا نئی بات اور نیا خیال ہے۔

تو میرے وجود کا تقاضہ   تو میرے عدم کی آبرو ہے

عاشق چاہتا ہے کہ محبوب ہمیشہ اس کے پاس رہے۔ عاشق کی ذات اور اس کے وجود کا تقاضہ ہے کہ معشوق کا وجود بھی ہو۔ بغیر معشوق کے عاشق کا وجود اس کی بقا اور بہ حیثیت عاشق اس کی پہچان بھی بے معنٰی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عشق میں عاشق کا مٹ جانا یا اس کی ہستی کا عدم ہو جانا بھی معشوق کے دم سے ہے۔ اگر معشوق نہ ہو تو اس مٹنے اور فنا ہونے کی بھی کوئی آبرو اور اعتبار نہیں۔ یہاں معشوق سے مراد کوئی زمینی مخلوق (انسان) بھی ہو سکتا ہے اور خدا کی ذات بھی۔

ہے دست دعا ہوا کا جھونکا   ہر پھول میں رنگ آرزو ہے

انسان اپنی دعاؤں میں اپنی آرزوؤں اور خواہشوں اور چاہتوں کا اظہار کرتا ہے، جو ہمہ اقسام کی اور ہر طرح کی ہوتی ہیں۔ گویا ان میں رنگارنگی پائی جاتی ہے۔ جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھتے ہیں تو بے شمار تمنائیں اور آرزوئیں اپنا رنگ بکھیرتی ہیں۔ شاعر سوچتا ہے کہ ہوا کا جھونکا بھی گویا کہ دست دعا ہے، کیوں کہ جب یہ بلند ہوتا ہے تو چمن میں بے شمار پھول کھلتے ہیں۔ شاعر کی نظر میں یہ پھول نہیں ہیں بلکہ رنگ برنگ آرزوئیں ہیں۔ اس شعر میں چمن کے پھولوں کو آرزوؤں کے مماثل ٹھہرایا گیا ہے۔

دنیا کے سوال سارے مجھ پر   چپ ہوں کہ مرا جواب تو ہے

عشق جب تک راز میں رہے عاشق کی ذات اور اس کی شخصیت عام انسان کی طرح ہوتی ہے، لیکن جب اس کا راز فاش ہو جاتا ہے تو عاشق کی ذات رسوائی اور بدنامی کے گھیرے میں آ جاتی ہے۔ لوگ اسے طنز و تعریض کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ ہر وقت، ہر مجلس اور ہر محفل میں بحث کا موضوع بن جاتا ہے اور ہر جگہ سوالات کی زد میں رہتا ہے، لیکن عاشق سوالات اور اعتراضات کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ ہر سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کرتا ہے، کیوں کہ ہر سوال کا جواب معشوق کی ذات ہے، جس کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔

مشکل الفاظ:

الفاظ	:	معنی
بنیاد گزار	:	بنیاد رکھنے والا
دانشور	:	عقل مند، وسیع علم اور ذہانت رکھنے والا
بساط	:	فرش، بچھونا، سرمایہ
خوباں	:	حسین لوگ، محبوب
ارضی	:	زمینی، اسی دنیا سے تعلق رکھنے والا
شغف	:	والہانہ لگاؤ، شوق
شوریدگی	:	بے چینی، دیوانگی، پریشان حالی
ہیجان	:	جوش، جذبات کی شدت
اندوہ	:	رنج، غم، تکلیف
واردات	:	واقعہ، حالات، جو بیتے یا گزرے
پیکر تراشی	:	الفاظ اور تخیل کی مدد سے کسی شئے یا واقعہ کی تصویر کھینچنا
بطن	:	پیٹ، اندرونی حصہ
تعریض	:	اعتراض کرنا
ہیچ	:	کچھ نہیں، بے اصل، بے حقیقت

مشقیں:

مشق 1: شامل نصاب غزل کے قافیوں کی فہرست بنائیں۔

....

....

....

مشق 2: اس غزل کے مطلع میں "وصال" اور "فراق" متضاد الفاظ ہیں۔ آپ سوچ کر پانچ الفاظ اور ان کی ضد لکھیں۔

1۔ ....

2۔ ....

3۔ ....

4۔ ....

5۔ ....

مشق 3: ترکیب "خوشبوئے بدن" میں ہمزۂ اضافت استعمال ہوا ہے۔ ہمزۂ اضافت کا، کی، کے، کا معنٰی دیتا ہے۔ ہمزۂ اضافت ستعمال کرتے ہوئے پانچ الفاظ لکھیے۔

1۔ ....

2۔ ....

3۔ ....

4۔ ....

5۔ ....

11.3 شہریار

11.3.1 شہریار کا تعارف:

گیان پیٹھ انعام یافتہ شہر یار کا اصل نام کنور اخلاق محمد خان ہے،جو16جون1936کو اپنے آبائی وطن آنولہ ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ان کے آبا و اجداد کا سلسلہ نسب پر تھوی راج چوہان سے ملتا ہے۔شہر یار کے پر دادا کنور دلاور محمد خان کی اکلوتے بیٹے کنور نیاز محمد خان کو چار اولادیں ہوئیں۔جس میں اقبال محمد خان ،کنور ابو محمد خان،کنور افتخار محمد خان ا ور کنور اعجاز محمد خان تھے۔شہر یار کے والد کنور ابو محمد خان کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے تھے اور اپنے بھائی بہنوں میں شہر یار سب سے چھوٹے تھے۔شہر یار کے والد ضلع ہر دوئی میں پولیس انسپکٹر تھے۔ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے علی گڑھ میں اپنے ہم زلف کے مکان میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔ان کا آبائی مکان جو بریلی میں تھا انھوں نے فروخت کر دیا تھا اور باقی خاندان کے افراد تقسیم ہند کے بعد ملک پاکستان میں مقیم ہو گئے تھے۔

شہر یار کی ابتدائی تعلیم ہر دوئی میں ہوئی۔1948میں علی وہ گڑھ آگئے اور1961میں اردو میں ایم۔اے کیا۔شہر یار کے والد کی خواہش تھی کہ وہ محکمہ پولیس سے منسلک ہو جائیں کیوں کہ شہر یار کے دونوں بڑے بھائی اور خاندان کے اکثر و بیشتر افراد اسی محکمے سے وابستہ تھے لیکن شہر یار نے اپنی راہ الگ چنی۔1966میں علی گڑھ مسلم یونیو رسٹی کے شعبہ اردو میں بحیثیت لکچر ان کا تقرر ہوا اور ساری عمر اردو کی خدمت میں لگے رہے۔علی گڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی سے ملاقات کے بعد ان میں شعر و شاعری کا جذبہ پروان چڑھنے لگا۔ابتدا میں کچھ غزلیں کنور محمد اخلاق خان کے نام سے لکھیں، بعد ازاں شاذ تمکنت کے مشورے پر انھوں نے اپنا تخلص 'شہر یار 'کر لیا۔شہر یار کو ہاکی ،بیڈمنٹن، رمی، گھومنے پھرنے اور کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا۔بچپن میں وہ اپنی والدہ سے کہانیاں سنا کرتے اور انھیں کے پاس سویا بھی کرتے تھے۔

1968میں شہر یار کی شادی نجمہ سے ہوئی جو علی گڑھ کے ویمنس کالج میں شعبہ انگریزی کی لکچر ر تھیں اور مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کے عزیز محمود خاں کی صاحب زادی تھیں۔ان سے تین اولادیں ہوئیں، ہمایوں شہر یار ، فریدوں شہر یاراور ایک بیٹی صائمہ۔شہر یار کا یہ ازدواجی رشتہ باہمی ناچاقی کی وجہ سے تاعمر قائم نہ رہ سکا۔2000میں نجمہ نے عدالت

میں مقدمہ دائر کر کے علاحدگی حاصل کر لی۔علاحدگی کے بعد شہریار بیمار رہنے لگے تھے۔ڈاکٹروں کی جانچ کے بعد معلوم ہوا کہ پھیپھڑے کا کینسر ہے ،بالآخر اس مہلک مرض سے مقابلہ کرتے ہوئے 13فروری2012کو اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

شہریار کا پہلا مجموعہ کلام'اسم اعظم' کے نام سے 1965میں چھپا، جس کا انتساب انھوں نے خلیل الرحمن اعظمی کے نام کیا۔دوسرا شعری مجموعہ 'ساتواں در' کے نام سے 1969میں کتاب گھر الہ آباد سے شائع ہوا،جس پر اترپردیش اردو اکادمی کی جانب سے انعام سے نوازا گیا۔تیسرا شعری مجموعہ 'ہجر کے موسم'1978اور چوتھا شعری مجموعہ 'خواب کا در بند ہے' 1985میں شائع ہوا۔پانچواں شعری مجموعہ 'نیند کی کرچیں'(1998)پر بنگال اردو اکادمی کی جانب سے"پرویز شاہدی کے انعام"سے نوازا گیا۔علاوہ ازیں دیگر مجموعے اردو اور دیوناگری رسم الخط میں علی گڑھ یونیورسٹی سے رٹائر ہونے کے بعد شائع ہوئے،جس میں 'شام ہونے والی ہے'(2004)،'قافلے یادوں کے'(پہلا انتخاب۔1987)،دھوپ کی دیواریں (1998)، 'دھند کی روشنی(منتخب نظمیں۔2003)، حاصل سیر جہاں (کلیات۔2001)، میرے حصے کی زمین(کلیات ہندی۔1998) وغیرہ شامل ہیں۔شہر یار کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں دیگر انعامات و اعزازات کے علاوہ 1987میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور 2008میں گیان پیٹھ ایواڑد سے بھی نوازا گیا۔

11.3.2شہریار کی غزل گوئی:

جدید شعرا میں شمار کیے جانے والے شاعر شہر یار کے یہاں ہمیں کلاسیکی اور جدید شعری روایت کا حسین سنگم ملتا ہے۔انھوں نے کلاسیکی روایت سے انحراف نہ کیا بلکہ قدیم شعری روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے اپنی شاعر ی کو جلا بخشی او ر انھیں قدروں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے موجودہ عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

انہوں نے اپنی شاعری میں اظہار ذات کے علاوہ موجودہ عہد کے سماجی و سیاسی مسائل،اخلاقی پستی،تنہائی،حزن و یاس، بے حسی،شکستہ حالی،عدم تحفظ جیسے موضوعات پر بڑے ہی فن کارانہ طور پر اظہار خیال کیاہے۔بعض اوقات ان موضوعات کے اظہار میں لہجے کی تلخی دکھائی دیتی ہے، لیکن ان کی فن کارانہ بصیرت اور مناسب لفظوں کا رکھ رکھاؤ جذبہ لطیف سے مزین ہو کر شعر کے حسن کو دوبالا کرنا ہے۔ان کی شاعری میں جہاں زندگی کے مختلف رنگ دیکھنے کو ملتے ہیں، وہیں بلند حوصلگی اور جوش و حرارت بھی اپنی گونا گوں خصوصیات کے ساتھ جلوہ نما ہے۔

امید سے کم چشم خریدار میں آئے
ہم لوگ ذرا دیر سے بازار میں آئے

لاکھ خورشید سر بام اگر ہیں تو رہیں
ہم کوئی موم نہیں ہیں کہ پگھل جائیں گے

شہر یار کے بچپن میں تقسیم ہند کا المیہ پیش آیا۔جس سے تمام ہندوستانی متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکے۔تقسیم ہند کے نتیجے میں پیش آنے والے فسادات اور ہجرت نے لوگوں کو حزن و الم میں مبتلا کر کے ایک نیا منظر نامہ پیش کیا۔ان نا مساعد حالات میں خونریزی ،لوٹ مار ،عصمت دری جیسے واقعات نے جس طرح انسانوں کے دلوں پر گہرے اثرات مرتب کیے، اس کا فن کارانہ بیان ہمیں شہر یار کی غزلوں میں واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔

ہر شخص مضمحل ہے بکھرنے کے خوف سے
آندھی کا قہر سر و صنوبر پہ دیکھ کر

کیا عجب رسم ہے دستور بھی کیا خوب ہے یہ
آگ بھڑکائے کوئی ،کوئی بجھانے آئے

دور جدید کے شعرا اکثر و بیشتر خوابوں کے ذریعہ اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتے ہیں۔خوابوں کے سہارے مختلف مضامین کو دائرہ اظہار میں لا کر جہان معنی کا رنگ عطا کرتے ہیں۔شہر یار کے یہاں بھی خواب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔انھوں نے بھی خواب کے سہارے دنیا و مافیہا کے بہت سے رنگوں کو اجاگر کیا ہے۔

زخموں کو رفو کر لیں دل شاد کریں پھر سے
خوابوں کی کوئی دنیا آباد کریں پھر سے

کون سا قہر یہ آنکھوں پہ ہوا ہے نازل
ایک مدت سے کوئی خواب نہ دیکھا ہم نے

سورج کا سفر ختم ہوا رات نہ آئی
حصے میں میرے خوابوں کی سوغات نہ آئی

شہر یار کی شاعری میں فکر و فن کی بلندی پائی جاتی ہے۔ان کے یہاں موضوعات کی پیش کش میں سطحیت کا احساس نہیں ہوتا۔الفاظ کے انتخاب اور ان کی مناسبت، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور تازگی مدد سے وہ اپنے شعر کو مزین کرتے ہیں، جس سے ان کا شاعرانہ حسن اور بھی نکھر کر قاری کے سامنے آتا ہے۔شہریار کی شاعری میں استفہامیہ اور خود کلامی کا انداز بھی پایاجاتا ہے۔ان کی شاعری ایک بڑی خصوصیت ان کے لہجے کا دھیما پن ہے جو دل کو ایک عجیب لطف و سرور سے دوچار کرتا ہے۔

11.3.3 غزل:(متن):

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہو گی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے

اب جدھر دیکھیے لگتا ہے کہ اس دنیا میں
کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے

آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب
یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں کچھ کم ہے

11.3.4 تشریح:

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

یہ غزل کا پہلا شعر ہے۔اس شعر میں شاعر نے زندگی کے فلسفے کو موضوع بحث بنایا ہے۔انسان کی زندگی کبھی نہ ختم ہونے والی خواہشات و توقعات سے عبارت ہے۔یہاں شاعر اپنی زندگی سے خوش بھی ہے اور نالاں بھی کہ اس کے ذہن میں زندگی کی جو تصویر ہے وہ اسے اپنی حقیقی زندگی میں کہیں دکھائی نہیں دیتی، جس کی وجہ سے اس کے احساس پر نا آسودہ خواہشات کی دستک بار بار ہوتی رہتی ہے۔

گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے
اپنے نقشے کے مطابق یہ زمیں کچھ کم ہے

اس شعر میں گھر کے تعمیر ی ممکنات کا تصور میں ہونا اور پھر نقشے کے مطابق زمین کے کم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ہر انسان کی آرزو ہوتی ہے کہ اپنا ایک آشیانہ تعمیر کرے ، لیکن اپنی آرزو کی بنیاد جس زمین پر رکھنی ہے وہ اس کے ذہنی خاکے کے مطابق نہیں ہے، کچھ کم ہے۔یعنی اس کی خوب سے خوب تر کی جستجو ہر وقت کمی کا احساس دلاتی رہتی ہے۔یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں جس عالی شان مکان کا نقشہ ہے اس کے پاس اس کی تعمیر کا سرمایہ یا وسائل نہیں ہیں۔

بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہو گی
دل میں امید تو کافی ہے یقیں کچھ کم ہے

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ انسان کی تمام زندگی امیدوں پر بسر ہوتی ہے۔اگر چہ انسان کی تمام امیدیں یقین میں نہیں بدلتیں۔اس لیے دل میں یقین کم ہے مگر امید کا عنصر غالب ہے کہ جو لوگ ہم سے بچھڑ گئے ہیں ان سے ایک نہ ایک دن ملاقات ضرور ہوگی۔

اب جدھر دیکھیے لگتا ہے کہ اس دنیا میں
کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے

اس شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی چیز مکمل نہیں ہے۔ ہر چیز میں کسی نہ کسی پہلو سے کوئی خامی یا نقص پایا جاتا ہے۔ بعض چیزیں ہر زاویے سے نہایت عمدہ اور بہترین ہوتی ہیں، لیکن اس میں کسی ایک عنصر کی زیادتی کی وجہ سے ان میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض اشیا ہر اعتبار سے اعلیٰ ہوتی ہیں، لیکن ان میں ایک بات کی کمی رہ جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ناقص رہ جاتی ہیں۔ یہ اصول دنیا کی ہر چیز اور کائنات کے ہر مظہر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر طرح کے نقص سے پاک، بے عیب اور کامل صرف خدا کی ذات ہے۔

آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب
یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں کچھ کم ہے

یہ غزل کا پانچواں اور آخری شعر ہے۔اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ آج بھی اس کے دل میں محبوب سے جدائی کا غم موجود ہے ، آج بھی جب محبوب سے دوری کا خیال آتا ہے تو دل رنجیدہ ہو جاتا ہے، لیکن وقت جو کہ بہت بڑا مرہم ہے وہ بڑے سے بڑا زخم بھر دیتا ہے۔اب غم میں وہ شدت باقی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

مشکل الفاظ:

توقع	امید، آس	Expectation, hope
ہر گھڑی	ہر وقت، ہمیشہ	All the time, always
احساس	محسوس کرنے کی صلاحیت	Feeling, perception
تعمیر ناآسودہ	جس کو تسکین نہ ملی ہو، بے چین	Uneasy mind, Unrested, Dissatisfied
تصور	خیال، سوچ	Imagination, Thought
مستحکم	مضبوط	Stable, Strong, Firm
جستجو	تلاش، کھوج	Search, Quest, Exploration

مشقیں:

مشق 1: درج ذیل لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ احساس ....
2 تصور ....
3۔ یقین ....

4۔ تقاضا ....

5۔ مجرم ....

مشق 2: اس غزل کے آخری شعر میں شاعر نے اپنی اداسی کا سبب کیا بتایا ہے؟ مختصر لکھیے۔

....

....

11.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- پروفیسر مغنی تبسم اردو کے مشہور نقاد، محقق، مدیر، شاعر اور دانشور تھے۔ انہوں نے فانی بدایونی پر پروفیسر مسعود حسین خاں کی رہنمائی میں تحقیقی مقالہ لکھا، جس پر عثمانیہ یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری عطا کی۔
- 1957 میں بہ حیثیت استاد شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔
- 1990 میں وہ پروفیسر بنائے گئے اور 15 فروری 2012 کو حیدرآباد میں انتقال کیا۔
- پروفیسر مغنی تبسم نے متعدد تنقیدی و تحقیقی کتابیں لکھیں، جیسے فانی بدایونی: حیات شخصیت اور شاعری، بازیافت، آواز اور آدمی، لفظوں کے آگے، زبان وادب، تحسین شعر، بساط نقد۔
- مغنی تبسم کے چار شعری مجموعے شائع ہوئے۔ نوائے تلخ، پہلی کرن کا بوجھ، مٹی مٹی میرا دل اور درد کے خیمے کے آس پاس۔
- پروفیسر مغنی تبسم ابتدا میں اقبال سے متاثر تھے۔ پھر وہ جدیدیت کی طرف مائل ہوئے۔ ان کی نظموں میں جدیدیت کا اثر صاف نظر آتا ہے۔
- مغنی تبسم کی غزلیہ شاعری ہر قسم کی تحریکات و رجحانات کے اثر سے آزاد نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری کی بنیاد فکر و فلسفے پر نہیں خالصتاً جذبہ و احساس پر رکھی۔
- "مٹی مٹی میرا دل" کی غزلوں پر ان کی شخصی زندگی کے ایک خاص سانحے یعنی ان کی چہیتی شریک زندگی کی اچانک وفات کے سانحے کا گہرا اور شدید اثر نظر آتا ہے۔
- ان کی غزلوں میں جذبات کی شدت کے ساتھ ایک خاص طرح کے ضبط غم اور ٹھہراؤ کی کیفیت ملتی ہے۔
- خود کلامی اور وارفتگی کی کیفیت، دھیما آہنگ، سرگوشی کا لہجہ، ملال اور افسردگی کی فضا مغنی تبسم کی غزلیہ شاعری کی امتیازی خصوصیات ہیں۔
- گیان پیٹھ انعام یافتہ شہر یار کا اصل نام کنور محمد اخلاق خان تھا۔ ان کی پیدائش 16 جون 1936 کو اپنے آبائی وطن آنولہ ضلع بریلی میں ہوئی تھی۔

- شہر یار کی ابتدائی تعلیم ہر دوئی میں ہوئی۔پھر وہ 1948 میں علی گڑھ آگئے اور 1961 میں اردو میں ایم۔اے کیا۔
- شہر یار ماہر تعلیم،شاعر اور نغمہ نگار کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں۔ان میں شعرو شاعری کا ذوق خلیل الرحمٰن اعظمی کی قربت سے پیدا ہوا۔
- ابتداً انہوں نے کنور محمد اخلاق کے نام سے لکھا بعد ازاں شہریار تخلص کیا۔ان کا پہلا مجموعہ کلام'اسم اعظم' کے نام سے 1965 میں چھپا۔جس کا انتساب انھوں نے خلیل الرحمن اعظمی کے نام کیا۔
- شہر یار نے کلاسیکی روایت سے انحراف نہ کیا بلکہ قدیم شعری روایت سے اپنا رشتہ استوار رکھتے ہوئے اپنی شاعر ی کو جلا بخشی اور انھیں قدروں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے موجودہ عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کامیاب کوشش بھی کی ہے۔
- شہر یار نے اپنی شاعری میں اظہار ذات کے علاوہ موجودہ عہد کے سماجی و سیاسی مسائل،اخلاقی پستی،تنہائی،حزن و یاس، بے حسی،شکستہ حالی،عدم تحفظ جیسے موضوعات پر بڑے ہی فن کارانہ طور پر اظہار خیال کیاہے۔

11.5 نمونہ امتحانی سوالات

11.5.1 معروضی سوالات:

1۔ مغنی تبسم کی ابتدائی دور کی شاعری پر کس شاعر کا اثر تھا؟

(a)میر (b)غالب (c)اقبال (d)فیض

2۔ "آواز اور آدمی"کا تعلق کس زمرے سے ہے؟

(a)شاعری (b)ترجمہ (c)ترتیب و تالیف (d)تنقید و تحقیق

3۔ مغنی تبسم کس رسالے کے ایڈیٹر تھے؟

(a)شگوفہ (b)سب رس (c)صبا (d)سوغات

4۔ ملال کی کیفیت اور ہجر کا تجربہ مغنی تبسم کی شاعری کا رشتہ کس شاعر سے جوڑتی ہے؟

(a)ناصر کاظمی (b)شہریار (c)عرفان صدیقی (d)احمد مشتاق

5۔ مغنی تبسم کا انتقال کب ہوا؟

(a)1980 (b)1990 (c)2012 (d)2015

6۔ شہریار کا اصل نام کیا تھا؟

(a)کنور محمد اخلاق (b)کنور محمد شہریار (c)اخلاق خان (d)شہریار خان

7۔ شہریار کا پہلا شعری مجموعہ کون سا ہے؟

(a)ساتواں درد (b)ہجر کے موسم (c)اسم اعظم (d)خواب کا در بند ہے

8۔ شہریار کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے کس سنہ میں نوازا گیا؟

(a) 2008 (b) 2009 (c) 2010 (d) 2012

9۔ شہریار نے کس کے کہنے پر اپنا تخلص "شہریار" اختیار کیا تھا؟

(a) عرفان صدیقی (b) شاذ تمکنت (c) ناصر کاظمی (d) مغنی تبسم

10۔ شہریار کا انتقال کب ہوا؟

(a) 2012 (b) 2014 (c) 2016 (d) 2018

11.5.2 مختصر جوابات کے حامل سولات:

1۔ مغنی تبسم کی تعلیم کا حال لکھیے۔

2۔ مغنی تبسم کی صحافتی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ شہریار کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

4۔ شہریار کی شعری مجموعوں کی تفصیل لکھیے۔

5۔ اس شعر کا مطلب بیان کیجیے۔

دنیا کے سارے سوال مجھ پر
چپ ہوں کہ مرا جواب تو ہے

11.5.3 طویل جوابات کے حامل سولات:

1۔ مغنی تبسم کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ مغنی تبسم کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

3۔ شہریار کی غزلوں کی نمایاں خوبیوں کی وضاحت کیجیے۔

11.5.1 کے جوابات:

(i) C	(ii) D	(iii) B	(iv) A	(v) C
(vi) A	(vii) C	(viii) A	(ix) B	(x) A

اکائی 12: نظم

"بنجارہ نامہ" نظیر اکبر آبادی

اکائی کے اجزا

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 نظم "بنجارہ نامہ" نظیر اکبر آبادی
12.2.1 نظم کی تعریف
12.2.2 نظیر اکبر آبادی کا تعارف
12.2.3 نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری
12.2.4 نظم "بنجارہ نامہ"
12.2.5 نظم "بنجارہ نامہ" کی تشریح
12.3 اکتسابی نتائج
12.4 مشکل الفاظ
12.5 مشقیں
12.6 نمونہ امتحانی سوالات

12.0 تمہید

نظم کے معنی موتیوں کی لڑی ہے۔ اصناف شاعری میں اس مربوط اظہار کو کہتے ہیں جس میں ربط و تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی بطور نظم نگار منفرد مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات پر اثر انداز میں اپنی نظموں میں محفوظ کیے۔ نظم بنجارہ نامہ میں انہوں نے حیات انسانی کے فلسفہ کو آسان اور سہل انداز میں پیش کیا ہے۔ اس اکائی میں آپ نظیر اکبر آبادی مشہور نظم "بنجارہ نامہ" کو پڑھیں گے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- نظم کے بارے میں جان سکیں۔
- نظیر اکبر آبادی کا تعارف پیش کر سکیں۔
- نظم "بنجارہ نامہ" کو صحیح طریقے سے پڑھ سکیں۔

- نظم "بنجارہ نامہ "کا خلاصہ اپنے لفظوں میں کر سکیں۔

12.2 نظم "بنجارہ نامہ" نظیر اکبر آبادی

12.2.1 نظم کی تعریف:

نظم کا لفظ عام طور سے نثر کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے اور جملہ اصناف شاعری کو بھی "نظم" ہی کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل، رباعی اور دیگر اصناف شعری نظم کے تحت آتے ہیں۔ اور شاعری کی محض ایک صنف کو بھی "نظم" کہتے ہیں، جسے عام طور پر غزل کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں "نظم" سے ہماری مراد یہی مخصوص صنف سخن ہے۔

غزل کی ہیئت مخصوص ہوتی ہے۔ اس کے سارے اشعار میں ایک ہی ردیف و قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے لیکن خیال یا مضمون کے اعتبار سے غزل کے اشعار ایک دوسرے بہت کم مربوط ہوتے ہیں۔ غزل کے بر خلاف نظم کی ہیئت مخصوص نہیں ہوتی، لیکن اس کے اشعار میں خیال یعنی مضمون کا تسلسل پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ نظم کسی ایک موضوع پر کہی جاتی ہے۔

اردو میں نظم نگاری پر نظیر اکبر آبادی نے بھرپور توجہ دی۔ نظیر کے بعد محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کا شمار، اردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے پہلی مرتبہ لاہور میں نئی طرز کے مشاعرے منعقد کیے۔ قدیم طرز کے مشاعروں میں کوئی طرحی مصرع دیا جاتا تھا اور تمام شعرا اسی مصرعے کی ردیف و قافیہ میں اپنی اپنی غزلیں پیش کرتے تھے۔ اس کے بر خلاف، ان مشاعروں میں کوئی موضوع تجویز کیا جاتا تھا، جس پر تمام شعرا نظمیں کہتے تھے۔ جہاں شعرا صرف نظمیں پیش کرتے ہیں، اسے شعری اصطلاح میں "مناظمہ" کہا جاتا ہے۔

محمد حسین آزاد اور حالی کے بعد اسماعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبال، جوش اور دوسرے شعرا نے اردو میں نظم نگاری کو فروغ دیا۔

12.2.2 نظیر اکبر آبادی کا تعارف:

سید ولی محمد نام، نظیر تخلص۔ 1735ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد فاروق تھا۔ شرفائے اکبر آباد میں تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اس زمانے کے دستور کے مطابق مولوی محمد کاظم اور ملا ولی محمد سے حاصل کی۔ فطری ذوق اور اس زمانے کے عام مذاق کی وجہ سے شعر و شاعری سے غیر معمولی دلچسپی لینے لگے۔ نظیر بہت منچلی طبیعت کے مالک تھے دوست احباب کا حلقہ وسیع تھا، پچیسی، شطرنج، چوسر میں مہارت حاصل تھی، کنکوے اور کبوتر اڑاتے تھے، ہندوستانی تہواروں مثلاً ہولی، دیوالی، رکھشا بندھن اور دسہرہ وغیرہ میں دلچسپی لیتے تھے۔ سورج مل جاٹ نے جب آگرہ پر حملہ کیا اس وقت نظیر قریب 28 اٹھائیس سال کے تھے۔ سورج مل نے تمام علاقہ تباہ و برباد کر دیا اور جاتے وقت سوہارام جاٹ کو آگرہ کا حاکم بنا گیا اس نے بھی خوب لوٹ مار مچائی۔ نظیر کا خاندان اس حادثے سے بہت متاثر ہوا۔ فکر معاش میں نظیر معلم بن گئے۔ انھیں زندگی کے نشیب و فراز کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور کی فکر میں انقلاب آفریں تبدیلی واقع ہوئی۔ بے ثباتی دنیا، جاہ و حشم کی دھوپ چھاؤں، زندگی کی بے وفائی کو انہوں نے پر اثر انداز میں اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ نظیر نے 1830ء میں وفات پائی۔

نظیر اکبر آبادی ایک ایسے شاعر ہیں جنہوں نے عوامی زندگی کو زیادہ اہمیت دی۔ انہوں نے ہر طبقہ کے انسان اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ حمد، نعت، منقبت، عید الفطر، شب برات، جیسی نظموں کے ساتھ ان کے پاس بلدیو جی کا میلا، ہولی، دیوالی، بسنت اور گرونانک پر بھی نظمیں ملتی ہیں جو ان کے مزاج کی رواداری کی ترجمانی کرتی ہیں۔

12.2.3 نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری:

اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی بطور نظم نگار منفرد مقام کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات پر اثر انداز میں اپنی نظموں میں محفوظ کیے۔ ابتدائی دور کے میلوں، ٹھیلوں میں شرکت کی تفصیلات، موسموں کا بیان، ہندوستان کے مختلف تہواروں جیسے عید الفطر، شب برات، دیوالی، دسہرہ، رکھشابندھن کی دل فریب رنگینیاں، غریبوں، فقیروں کے حالات، روٹی، جھونپڑا وغیرہ پر اظہار خیال۔ آگرہ کی تباہی کے بعد بے ثباتی دنیا اور انسانی زندگی کی ناپائیداری کا بیان ان کے پاس ملتا ہے۔ نظیر اپنی نظموں میں عوامی محاورہ اور عوامی زبان کا استعمال مہارت کے ساتھ کرتے ہیں وہ بازاروں، عرسوں اور تہواروں میں عوام کے درمیان اپنا وقت گزارتے تھے اس لیے انسانی نفسیات اور جذبات کو ہو بہو نظم کر دینے میں انہیں ملکہ حاصل تھا وہ بلالحاظِ مذہب وملت، رنگ ونسل، حسب نسب، عوامی رجحانات کی عکاسی کرتے تھے۔ ان کے پاس الفاظ کا بڑا اور رنگا رنگ ذخیرہ تھا یہی وجہ تھی کہ ایک ہی موضوع پر مختلف زاویوں سے دیکھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت ان میں تھی مثلاً موسم برسات کے عنوان پر انہوں نے ایک سے زائد نظمیں لکھیں، برسات کی بہاریں، برسات کا تماشہ، موسم برسات وغیرہ ان نظموں میں انہوں نے برسات کی تفصیلات اور مختلف طبقات کی کیفیات تفصیل سے بیان کی ہیں۔ چند نظمیں قلندروں اور گداگروں کے لیے لکھی گئی ہیں مثلاً افلاس، جھونپڑا، ہنس نامہ وغیرہ۔ ان کے پاس ایسے موضوعات بھی ملتے ہیں جن پر نہ تو نظیر سے پہلے کسی نے اسے نظم کا موضوع بنایا اور نہ ہی کسی نے نظیر کے بعد ان پر قلم اٹھایا جیسے پنکھا، کورا برتن، لکڑی، بٹوا وغیرہ۔ ان کی اکثر وبیشتر نظمیں دنیا کی بے ثباتی، زندگی کی ناپائداری ہر چیز کی فنایت کو پر اثر انداز میں پیش کرتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اپنے دور کے معاشرے اور سماج کے عکاس بھی تھے۔ ان کی تمام تر نظموں میں زندگی کے تمام موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ہندوستانی ماحول موجود ہے اور ہندو مسلم تہواروں، عیدوں، میلوں، ٹھیلوں، اور کھیل تماشوں پر ان کی کئی نظمیں موجود ہیں۔ انہوں نے سادہ اور بول چال کی زبان استعمال کی۔ موقع کی مناسبت سے ہندی بھاشا کے الفاظ بھی اپنی نظموں میں استعمال کر لیتے تھے۔ ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ان کی شاعری عوامی شاعری کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

12.2.4 نظم "بنجارہ نامہ":

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئی پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقیٰ سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

تو بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں ہانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی
اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھکنی

کیا برتن سونے چاندی کے کیا مٹی کی ہنڈیا چینی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی ہر آن بنے گی جان اوپر
نقارے نوبت بان نشاں دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھپّر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے
کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پتّا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجّر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہے خم تیرے تن کا ہے پولا
تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنواں کیا گھاٹ سرا کیا باغ چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سیے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیرؔ اک تنکا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

12.2.5 نظم "بنجارہ نامہ" کی تشریح:

نظیر اکبر آبادی نے اپنی اس نظم میں بنجارے کو بطور انسان علامتی انداز میں پیش کرتے ہوئے دنیا اور دنیاوی چیزوں سے دل نہ لگانے کی تلقین کی ہے۔ بنجارے کسی ایک مقام پر قیام نہیں کرتے، موسم، کام اور دوسری چیزوں کے مطابق نقل مقام کرتے رہتے ہیں۔ انسان بھی اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آیا ہے۔

پانچ پانچ مصرعوں پر مشتمل بندوں میں جسے مخمس کی ہیئت کہا جاتا ہے، ٹیپ کا مصرع "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا" استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں نظیر کہتے ہیں کہ اپنے وطن کو چھوڑ کر دیس بدیس پھر کر دولت جمع کرنے کی حرص میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ کس وقت اسے موت آجائے۔ جمع کی ہوئی دولت، مال اسباب یہیں پر رہ جائے گا اور انسان اس دنیا سے خالی ہاتھ کوچ کر جائے گا۔ انسان کی زندگی فانی ہے اور انسان جو کچھ بھی جمع کرتا ہے وہ یہیں پڑا رہ جاتا ہے۔

شاعر کا کہنا ہے کہ انسان اگر تجارت کا پیشہ اپناتا ہے تو شکر، مصری، منقیٰ، سونٹھ، مرچ، لونگ، سپاری وغیرہ جمع کرتا ہے لیکن انسان سے بھی بڑا ایک بیوپاری ہے وہ جب چاہتا ہے انسان کو واپس طلب کر کے اس تمام سرمائے سے اسے بے تعلق بنا دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں دنیا کی دولت یہیں رہ جاتی ہے اور انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

نظیر کا کہنا ہے کہ جب انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے گھر والے، آل اولاد، بال بچے، بیوی کوئی بھی اس سفر میں اس کا ساتھ نہیں دے پاتے اور اسے اکیلے ہی اس دنیا سے جانا پڑتا ہے۔ یہ حقیقت ہے ایسی حقیقت جسے سبھی کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ ہیرے جواہرات، سونا چاندی، روپیہ پیسہ، شان و شوکت، جاہ و حشمت، سب کچھ اسی وقت تک ساتھ ہیں جب تک کہ انسان زندہ ہے اس کی سانسیں چل رہی ہیں جب زندگی اپنے اختتام کو پہنچتی ہے تو یہ ساری اشیا بے وقعت، بے حقیقت ہو جاتی ہیں اسی دنیا میں رہ جاتی ہیں اور انسان اس جہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔

بلند وبالا عمارتیں بنائی جاتی ہیں لیکن آخر میں انسان کو قبر کے اندھیرے گڑھے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر مقام و مرتبہ کا آدمی اسی مقام کو پہنچتا ہے۔

انسان کے مر جانے کے بعد اس کا اثاثہ زندہ رہنے والوں کے لیے توجہ کا مرکز اور اسے حاصل کرنا ان کا مقصد بن جاتا ہے جب کہ مرنے والا قبر میں اکیلا رہ جاتا ہے۔

اس نظم میں مختلف پیرایوں سے نظیر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انسان کی زندگی فانی ہے اس دنیا کے عیش و عشرت اور آرام و آسائش میں اپنے آپ کو گم کرنے کے بجائے حرص و ہوس سے کنارہ کشی اختیار کر لینا چاہیے۔ اناج، دانہ پانی، جانور، اور دنیا کی آسائشوں کو جمع نہیں کرنا چاہیے بلکہ نیک اعمال کو اپنا زاد راہ بنانا چاہیے کیونکہ اجل کا قزاق ہم کو لوٹے تو ہمارے ساتھ صرف ہمارے اعمال اس دنیا سے ساتھ جائیں گے جب کہ دنیاوی چیزیں دنیا میں ہی رہ جائیں گی۔ نظیر دنیا کی دولت، مال واسباب، اقتدار اور اختیار کے بر قدر و قیمت ہونے پر روشنی ڈالے ہوئے زندگی اور دنیا کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انسان فانی زندگی کی آسائشوں کے لیے انسانیت سے دست برداری اختیار نہ کرے۔ آدمی ساری زندگی کنبہ، خاندان اور افراد خاندان کے لیے محنت کرتا ہے۔ جائز اور ناجائز طریقوں سے ان کے لیے راحت کے سامان فراہم کرتا ہے لیکن یہ سب کچھ اس کے کوئی کام نہیں آتے۔ اس لیے اس دنیا کو عارضی قیام کا مقام سمجھتے ہوئے زندگی گزارنی چاہیے اور جہاں تک ہو سکے ایسی زندگی گزارنی چاہیے جو بعد میں اس کے لیے باعث راحت ہو۔

12.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- نظم کے معنی موتیوں کی لڑی ہے۔ اصناف شاعری میں کسی موضوع پر مربوط کلام کو نظم کہتے ہیں۔
- اردو میں نظم نگاری کو آگے بڑھانے والوں میں نظیر اکبر آبادی سر فہرست ہیں۔ نظیر کے بعد محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کا شمار، اردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اسماعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبال، جوش اور دوسرے شعرا نے نظم نگاری کو فروغ دیا۔
- اردو شاعری میں نظیر اکبر آبادی بطور نظم نگار منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔
- نظم " بنجارہ نامہ " میں نظیر اکبر آبادی نے دنیا اور انسانی زندگی کی ناپائیداری کا بیان بڑے ہی پر اثر انداز میں کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس فانی دنیا کی آسائش اور آرام کے لیے آدمی شبانہ روز محنت و مشقت سے کام لیتا ہے۔ تجارت کے لیے اجناس جمع کرتا ہے۔ اونچے اونچے پختہ مضبوط مکانات بنواتا ہے۔ بال بچوں کی پوری دل جمعی کے ساتھ نگہداشت کرتا ہے لیکن جب موت کا وقت آتا ہے تو یہ ساری چیزیں اسی دنیا میں رہ جاتی ہیں مال واسباب کام آتا ہے اور نہ ہی آل اولاد، بیوی بھی اس سفر میں اس کا ساتھ نہیں دے پاتی اور وہ اکیلا ہی اس سفر پر سب کچھ چھوڑ کر روانہ ہو جاتا ہے ان تمام باتوں کے پیچھے یہ بات چھپی ہے کہ اچھے اعمال اگر اس زندگی میں انجام دے تو یہ سفر آخرت میں زاد راہ ثابت ہوتے ہیں یہ عقیدہ کم و بیش سارے مذاہب میں موجود ہے اس لیے شاعر دنیا کی ناپائیداری اور انسانی زندگی کی بے مائیگی کو واضح کرتے ہوئے خدائے بزرگ و برتر کی عظمت اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی افادیت کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کرتا نظر آتا ہے۔

12.4 مشکل الفاظ

قزاق	رہزن، چور	Pirate, robber
نقارہ	نوبت، طبل	Drum, kettle drum
ناتی	نواسی	Granddaughter (daughter's daughter)
لعل	سرخ رنگ کا قیمتی پتھر	Ruby, red precious stone
سیم	چاندی	Silver
باٹ	راستہ	Path, way
گور	قبر	Grave
اجل	موت	Death
چترا	ہوشیار، چالاک	Clever, Smart, Intelligent
پوتا	بیٹے کا بیٹا	Grandson (son's son)
زمرد	سبز رنگ کا قیمتی پتھر	Emerald, Green precious stone
زر	روپیہ	Gold, Money
حشمت	بزرگی، عظمت	Grandeur, Magnificence
بے ثباتی	جس میں ٹھہراو نہ ہو، مرادی معنی کمزور	Instability, Lack of firmness
چابک	کوڑا	Whip, Knout, Quirt, Scourge
مرگ	موت	Death
بقچے	چھوٹی گٹھڑی، پوٹلی	Small bundle, pouch

12.5 مشقیں

مشق 1: عبارت کو پڑھ کر نیچے دیے گئے سوالوں کے جواب لکھیے۔

"اردو میں نظم نگاری پر نظیر اکبر آبادی نے بھرپور توجہ دی۔ نظیر کے بعد محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کا شمار، اردو نظم کے معماروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے پہلی مرتبہ لاہور میں نئی طرز کے مشاعرے منعقد کیے۔ قدیم طرز کے مشاعروں میں ایک طرحی مصرع دیا جاتا تھا اور تمام شعرا اسی مصرعے کے ردیف و قافیہ میں اپنی اپنی غزلیں پیش کرتے تھے۔ اس کے برخلاف، ان مشاعروں میں کوئی موضوع تجویز کیا جاتا تھا، جس پر تمام شعرا نظمیں کہتے تھے۔ جہاں شعرا صرف نظمیں پیش کرتے ہیں، اسے شعری اصطلاح میں "مناظمہ" کہا جاتا ہے۔ آزاد اور حالی کے بعد اسماعیل میرٹھی، چکبست، سرور جہاں آبادی، اقبال، جوش اور دوسرے شعرا نے نظم نگاری کو فروغ دیا۔"

i. نظم نگاری پر بھرپور توجہ کس نے دی؟ (   )
ii. محمد حسین آزاد اور حالی کا شمار کس صنف کے معماروں میں ہوتا ہے؟ (   )
iii. جہاں شعرا صرف نظمیں کہتے ہیں اسے کیا کہا جاتا ہے؟ (   )
iv. اسمٰعیل میرٹھی اور چکبست کس صنف کے شاعر ہیں؟ (   )

12.6 نمونہ امتحانی سوالات

12.6.1 معروضی سوالات:

(1) نظیرؔ کا پورا نام کیا تھا؟

(a) ولی محمد (b) علی محمد (c) عطا محمد (d) سید محمد

(2) نظیر کہاں پیدا ہوئے؟

(a) شاہ جہاں باد (b) اکبر آباد (c) دہلی (d) آگرہ

(3) نظیر کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

(a) 1735 (b) 1730 (c) 1740 (d) 1750

(4) سورج مل جاٹ نے جب آگرہ پر حملہ کیا تو اس وقت نظیر کی کیا عمر تھی؟

(a) 20سال (b) 25سال (c) 28سال (d) 40سال

(5) نظیرؔ کا انتقال کب ہوا؟

(a) 1820 (b) 1840 (c) 1810 (d) 1830

(6) قزاق کے معنی کیا ہیں؟

(a) چور، رہزن (b) ایماندار (c) سچا (d) پارسا

(7) مخمس کے ہر بند میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟

(a) پانچ (b) چار (c) چھے (d) آٹھ

(8) بنجارہ نامہ کس کی نظم ہے؟

(a) میر حسن (b) نظیر (c) سودا (d) حالی

(9) نظیر نے بنجارہ کو بطور.................... پیش کیا ہے؟

(a) علامت (b) تلمیح (c) تشبیہ (d) استعارہ

(10) قزاق کے کیا معنی ہیں؟

(a) لٹیرا (b) پارسا (c) محافظ (d) کاریگر

12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. نظم کسے کہتے ہیں؟ لکھیے۔
2. اردو کے چند مشہور نظم نگاروں کے نام لکھیے۔
3. سورج مل جاٹ نے جب آگرہ پر حملہ کیا تو اس وقت کیا حالات تھے۔ چند جملوں میں بیان کیجیے۔
4. اس نظم کے ذریعہ نظیر نے کیا پیغام دیا ہے۔
5. اس بند کی تشریح کیجیے۔

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا
قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گونیں پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں اور انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. نظیر اکبر آبادی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. نظیر کی نظموں کی خصوصیات بتائیے۔
3. نظم بنجارہ نامہ کا خلاصہ لکھیے۔

12.6.1 کے جوابات:

(i) A (ii) D (iii) A (iv) C (v) D

(vi) A (vii) C (viii) B (ix) A (x) A

بلاک IV

اکائی 13: نظم

"او دیس سے آنے والے بتا" (اختر شیرانی)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 نظم: "او دیس سے آنے والے بتا" (اختر شیرانی)
13.2.1 اختر شیرانی کا تعارف
13.2.2 اختر شیرانی کی نظم نگاری
13.2.3 نظم: "او دیس سے آنے والے بتا"
13.2.4 نظم کی تشریح
13.3 اکتسابی نتائج
13.4 مشکل الفاظ
13.5 مشقیں
13.6 نمونہ امتحانی سوالات

13.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے نظیر اکبر آبادی کی نظم "بنجارہ نامہ" کا مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں آپ اختر شیرانی کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کا مطالعہ کریں گے۔

اختر شیرانی کا شمار اردو کی رومانوی تحریک سے وابستہ شاعروں میں ہوتا ہے۔ یہ اردو کے نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے جنھوں نے اردو نظم نگاری میں بہ حیثیت رومانوی شاعر اختر شیرانی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ ان کی شاعری رومانویت اور حسن و جمال پرستی کی مظہر ہے۔ رومانوی جذبات کی عکاسی میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ نظم کو مختلف بند اور ہیئتوں سے وابستہ کر کے اختر شیرانی نے نظم میں گیت کا حسن پیدا کیا ہے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- اختر شیرانی کے حالات زندگی اور ان کی شخصیت سے واقف ہو سکیں۔

- اختر شیرانی کی نظم نگاری کی خصوصیات کو بیان کر سکیں۔
- نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کی تشریح کر سکیں۔

13.2 اختر شیرانی کے حالاتِ زندگی

13.2.1 اختر شیرانی کا تعارف:

اختر شیرانی کا پورا نام محمد داؤد خاں تھا۔ ان کے والد حافظ محمود شیرانی اردو کے چوٹی کے محقق ادیب اور لسانیات کے ماہر تھے۔ ان کے خاندان کا تعلق پٹھانوں کے مشہور قبیلے شیرانی سے تھا۔ حافظ محمود شیرانی کے والد ریاست ٹونک میں ملازم تھے۔ اختر شیرانی 4 مئی 1905 کو ٹونگرہ نامی گاؤں میں پیدا ہوئے جو ریاست ٹونک کا ایک حصہ تھا۔ محمد داؤد خاں شیرانی کی پیدائش کے وقت حافظ محمود شیرانی انگلستان میں تھے۔ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم سے ہوئی۔ کم عمری میں شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ تعلیم کا آغاز ناظرہ قرآن مجید کی تعلیم سے ہوا۔ بچپن سے شاعری کا شوق تھا۔ ابتدا میں صابر علی شاکرؔ سے کلام پر اصلاح لی۔

1921ء میں اپنے والد کے ساتھ لاہور منتقل ہوئے۔ اختر شیرانی نے لاہور آنے کے بعد 1921ء میں اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ اسی سال منشی فاضل کا امتحان اچھے نمبروں سے کامیاب کیا۔ اگلے سال اسی کالج سے ادیب فاضل میں کامیابی حاصل کی۔ بعد میں میٹرک بھی کر لیا۔ کوئی اعلیٰ سند نہ ہونے کے باوجود انھیں انگریزی ادب میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔

اردو کے رومانوی شاعروں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی شاعری رومانوی احساسات کی نمائندہ ہے۔ ان سے آٹھ شعری مجموعے اور خطوط کا ایک مجموعہ یادگار ہیں۔ ان کی شاعری کے مجموعے: (1) شعرستان (2) صبح بہار (3) نغمۂ حرم (4) طیور آوارہ (5) اخترستان (6) شہزور (7) لالۂ آوارہ (8) شہناز کے نام شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا انتقال 1948ء میں لاہور میں ہوا۔

13.2.2 اختر شیرانی کی نظم نگاری:

اختر شیرانی اپنے دور کے بے حد مقبول شاعر تھے۔ ان کے زمانے کی نوجوان نسل ان سے پرستش کی حد تک عقیدت رکھتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اردو شاعری کے حقیقی معنوں میں رومانی شاعر تھے۔ ان کی رومانویت کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے کہ "اختر اردو ادب میں رومانوی تحریک کی اعلیٰ ترین تخلیق ہیں"۔

رومانوی تحریک کا اثر اردو شاعری پر بہت کم مدت کے لیے رہا۔ کچھ رومانوی شعرا کے کلام میں انگریزی شاعری کی جھلک ملتی ہے، تو کچھ نے انقلاب نظمیں لکھی۔ کچھ فطرت کے گیت گاتے گاتے ترقی پسندی تک پہنچ گئے۔ لیکن اختر شیرانی شروع سے آخر تک رومانوی شاعری کرتے رہے۔

رومانویت سے ان کی پر خلوص دوستی ہمیشہ قائم رہی۔ جس کی گواہی ان کے کلام دے رہے ہیں۔ اختر شیرانی نے نہ صرف انگریزی رومانوی شاعر سے فائدہ اٹھایا بلکہ ان کی رومانی شاعری پر عربی، فارسی اور اردو شاعری کے واضح اثرات نمایاں ہیں۔ انہوں نے اپنے کلام میں رومانویت کے جن عناصر کو زیادہ آشکار کیا وہ تخیل پرستی ہے۔ ان کے یہاں جذبات و احساسات کی کارفرمائی بھی بھرپور

نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری میں غنائیت اور موسیقیت بھی پائی جاتی ہے۔ فطرت نگاری میں بھی اختر شیرانی نے عربی، فارسی کلام سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔ وہ تشبیہات واستعارات کی مدد سے گنگنانے کی صلاحیت دے دیتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ان کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" ہے۔ جس کا ہم اس اکائی میں مطالعہ کریں گے۔

اختر شیرانی نے نظم نگاری کو نت نئے موضوعات سے روشناس کیا ہے۔ مناظر قدرت کی عکاسی اور عورتوں اور بچوں کی حمایت میں ان کی نظم نگاری اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ بچوں کی نظموں کا مجموعہ "پھولوں کے گیت" لاہور سے 1936ء میں شائع ہوا۔ "نغمۂ حرم" مکتبہ اردو لاہور سے 1939ء میں شائع ہوا ۔ اس مجموعے میں زیادہ تر وہ نظمیں شامل ہیں جنھیں صنف نسواں کی "تفسیر حیات" کا سرمایہ دار کہا جاسکتا ہے۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختر شیرانی کی نظمیں ہر موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔

13.2.3 نظم: "او دیس سے آنے والے بتا":

(1)

او دیس سے آنے والے بتا

او دیس سے آنے والے بتا
آوارۂ غربت کو بھی سنا
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن

کس حال میں ہیں یارانِ وطن
کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ سرو وطن ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا

(2)

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں

مستانہ ہوائیں آتی ہیں
گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(3)

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی
کیا اب بھی سہانی راتوں کو
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے

سرمست نظارے ہوتے ہیں
وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
کیا اب وہی سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(4)

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی شفق کے سایوں میں
دن رات کے دامن ملتے ہیں
کیا اب بھی چمن میں ویسے ہی
خوش رنگ شگوفے کھلتے ہیں
برساتی ہوا کی لہروں سے
بھیگے ہوئے پودے ہلتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(5)

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی مہکتے مندر سے
ناقوس کی آواز آتی ہے
کیا اب بھی مقدس مسجد پر
مستانہ اذاں تھراتی ہے
اور شام کے رنگیں سایوں پر
عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

(6)

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں کے پنگھٹ پر
پنہاریاں پانی بھرتی ہیں
انگڑائی کا نقشہ بن بن کر
سب ماتھے پہ گاگر دھرتی ہیں
اور اپنے گھروں کو جاتے ہوئے
ہنستی ہوئی چہلیں کرتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(7)

او دیس سے آنے والے بتا

کیا اب بھی وہاں برسات کے دن
باغوں میں بہاریں آتی ہیں
معصوم و حسیں دوشیزائیں
برکھا کے ترانے گاتی ہیں
اور تیتریوں کی طرح سے رنگیں
جھولوں پر لہراتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(8)

او دیس سے آنے والے بتا

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں
احباب کنار دریا پر

وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں
شاداب کنار دریا پر
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے
مہتاب کنار دریا پر
او دیس سے آنے والے بتا

(9)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا پہلی سی ہے معصوم ابھی
وہ مدرسے کی شاداب فضا
کچھ بھولے ہوئے دن گزرے ہیں
جس میں وہ مثال خواب فضا
وہ کھیل وہ ہم سن وہ میداں
وہ خواب گہہ مہتاب فضا
او دیس سے آنے والے بتا

(10)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی کسی کے سینے میں
باقی ہے ہماری چاہ بتا
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے
اب یاروں میں کوئی آہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا
للہ بتا اللہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا

(11)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا ہم کو وطن کے باغوں کی
مستانہ فضائیں بھول گئیں
برکھا کی بہاریں بھول گئیں
ساون کی گھٹائیں بھول گئیں
دریا کے کنارے بھول گئے
جنگل کی ہوائیں بھول گئیں
او دیس سے آنے والے بتا

(12)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا گاؤں پہ اب بھی ساون میں
برکھا کی بہاریں چھاتی ہیں
معصوم گھروں سے بھور بھئے
چکی کی صدائیں آتی ہیں
اور یاد میں اپنے میکے کی
بچھڑی ہوئی سکھیاں گاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(13)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا گاؤں میں اب بھی ویسی ہی
مستی بھری راتیں آتی ہیں
دیہات کی کمسن ماہ وشیں
تالاب کی جانب جاتی ہیں
اور چاند کی سادہ روشنی میں
رنگین ترانے گاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(14)

او دیس سے آنے والے بتا
کیا اب بھی گجر دم چرواہے
ریوڑ کو چرانے جاتے ہیں
اور شام کے دھندلے سایوں کے
ہم راہ گھروں کو آتے ہیں
اور اپنی رسیلی بانسریوں
میں عشق کے نغمے گاتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا

(15)

او دیس سے آنے والے بتا
آخر میں یہ حسرت ہے کہ بتا
وہ غارت ایماں کیسی ہے
بچپن میں جو آفت ڈھاتی تھی
وہ آفت دوراں کیسی ہے
ہم دونوں تھے جس کے پروانے
وہ شمع شبستاں کیسی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

(16)

او دیس سے آنے والے بتا
مرجاناتھا جس کا نام بتا
وہ غنچہ دہن کس حال میں ہے
جس پر تھے فدا اطفالِ وطن
وہ جانِ وطن کس حال میں ہے
وہ سرو چمن وہ رشک سمن
وہ سیم بدن کس حال میں ہے
او دیس سے آنے والے بتا

13.2.4 نظم کی تشریح:

اس نظم میں اختر شیرانی نے کیفیاتی فضا باندھی ہے۔ یہ ترجیح بند کے فارم میں ہے جس میں چھ مصرعے ہیں۔ یہ نظم جملہ اٹھارہ بندوں پر مشتمل ہے اور ہر بند میں ایک کیفیت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پہلے بند میں وطن کے باغوں، مستانہ ہواؤں، پہاڑوں کی گھنگھور

گھٹاؤں اور بر کھاؤں کا ذکر موجود ہے۔ دوسرے بندے میں باغ کے شگفتہ پھولوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ تیسرے بند میں وطن کی گلیوں اور وہاں کی سڑکوں اور شاموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد چوتھے بند میں وطن کی راتوں اور گیتوں کی کیفیت کو نظم کیا گیا ہے۔ پانچویں بند میں وطن کے پن گھٹ اور اس کی حسیناؤں کے جھرمٹ کا ذکر کیا ہے۔ جس کے بعد اختر شیر انی نے برسات، طوفان اور ملاح کے ترانوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات دریافت کی ہے کہ شام کے وقت لوگوں کا دریا کے کنارے جانا اور گھنیرے پیڑوں کے نیچے بیٹھ کر شادابی حاصل کرنا یہ تمام کیفیتیں اب بھی جاری ہیں یا نہیں؟ آم کے اونچے پیڑوں اور شاخوں پر پپیہوں کے نغموں کے علاوہ ساون کے رسیلے گیتوں کا ذکر کرتے ہوئے اختر شیر انی نے دریافت کیا ہے کہ وطن والوں کے دل میں کیا اب بھی وہی چاہت ہے اور کوئی یار دوست آہیں بھر کر ہمیں یاد کرنے والا موجود بھی ہے یا نہیں؟ گاؤں کی مستی بھری راتوں، تالاب کا منظر، رنگین ترانے اور چاند کی سادہ روشنی کا حوالہ دیتے ہوئے اختر شیر انی نے گاؤں کے ساون، بر کھا کی بہاریں، چکی کی صدائیں اور مہکی ہوئی یادوں کا ذکر دلچسپ شاعرانہ پیرائے میں کیا ہے۔ اختر شیر انی نے گاؤں کے تالاب، گھاٹ، ہواؤں اور فضاؤں کے علاوہ کھیت، جنگل اور چڑیا کی صداؤں کے بارے میں مؤثر نمائندگی کی ہے نظم کے آخری حصے میں شوخ و چنچل حسیناؤں کی بات کرتے ہوئے اختر شیر انی نے یہ بات واضح کی ہے کہ میٹھے بول سنانے والی اس ملک میں کس حال میں ہے۔ چاند جیسا بدن جس پر چمن ناز کرتا ہو اس کا کیا حال ہے۔ اپنے وطن کے نظاروں کو جنت کے روشن نظاروں سے تعبیر کرتے ہوئے اختیر شیر انی نے اپنے وطن کی لڑکیوں کی رسیلی آنکھوں اور گلابی ہونٹوں کی تعریف دل نشین انداز میں کی ہے اور بتایا ہے کہ وہ جب روتی ہیں تو ساون کے ستارے روشن ہو جاتے ہیں اور جب وہ بات کرتی ہیں تو بجلی کے شرارے نمایاں ہو جاتے ہیں اور آخر میں اپنے وطن کی نوخیز لڑکیوں کے مائکہ میں رہنے یا سسرال چلے جانے کے بارے میں دریافت کیا ہے۔ اختر شیر انی نے کسی دوشیزہ پر آنے والی جوانی کو ایک آفت قرار دیتے ہوئے یہ بھی دریافت کیا کہ کیا وہ گھر پر ہی رہی یا گھر سے چلی گئی۔ ہر دو حال میں وہ خوش حال بھی رہتی ہے یا خوش حال جاتی ہے۔ اپنے ان جذبات اور احساسات کے ذریعہ نظم لکھ کر اختر شیر انی نے اپنے وطن کی کیفیت دریافت کرنے کے دوران بھی جمالیات کا حسین تصور ابھارا ہے اور مختلف منظروں کی نمائندگی یہ ثبوت فراہم کرتی ہے کہ اختر شیر انی نظم کے دوران رومانی فضا تیار کرنے میں بڑی قدرت رکھتے ہیں۔

اردو کے بیشتر شعرا نے وطنی شاعری میں اپنے وطن سے خطاب کیا ہے اور وطن کی بے شمار عمارتوں اور ان کی یادگاروں سے اپنی والہانہ محبت کو ظاہر کیا۔ اردو کے تمام وطنی شاعروں کے مقابلہ میں اختر شیر انی کا شعری انداز جداگانہ ہے ان کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" ایک کامیاب وطنی نظم ہے۔ اس نظم میں رومانی اور جمالیاتی احساسات کو شامل کرتے ہوئے اختر شیر انی نے کیف پرور فضا تیار کی ہے۔ ان مناظر کی نشاندہی نظم کا خاصہ ہے جو حسن و عشق کے آئینہ دار یا فطری مناظر کے امین ہیں۔ گاؤں، پنگھٹ، ہوائیں، فضائیں، کھیت، جنگل، ساون اور بہار کے ذکر کے ساتھ ایک حسین دوشیزہ کا تصور بھی اس نظم میں نمایاں ہوتا ہے اور اس دوشیزہ کے حسن پر نکھار آنے والے مناظر کو بھی اختر شیر انی نظم کا حصہ بنالیتے ہیں۔ اس لیے یہ نظم وطنی شاعری سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ رومانی احساسات کی بھی آئینہ دار بن جاتی ہے۔ حسن و جمال کا پاکیزہ تصور اس نظم میں ابھرتا ہے۔ اختر شیر انی نے جسمانی حسن اور قدرتی حسن کو اس نظم میں شامل کر کے دونوں حسن کے درمیان شامل حسیت کو لفظوں کے اندر بیان کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں اختر شیر انی کی وطن پرستی کے ساتھ ساتھ جمالیات پرستی بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ وطن سے محبت کے ساتھ ساتھ حسن اور محبت جیسے جذبوں کو ایک

ہی نظم میں بے اختیار انداز میں شامل کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن اختر شیرانی نے اس نظم میں دونوں کیفیتوں کو شامل کرکے نظم کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم ان کے جمالیاتی احساس کے ساتھ وطن پرستی کے جذبہ کو فروغ دینے کا کام انجام دینے والی اہم نظم کا درجہ رکھتی ہے۔

13.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- اختر شیرانی کا تعلق ریاست ٹونک کے مایہ ناز خاندان سے تھا۔ ان کی پیدائش 1905ء میں ہوئی۔
- اختر شیرانی کی تعلیم و تربیت گھر پر ہوئی پھر انہوں نے شعر گوئی کی طرف توجہ دی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کا مزاج حسن و عشق پرست تھا۔
- انہوں نے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کے علاوہ جنگ اور جد و جہد آزادی پر بھی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں بھی رومانویت کا اثر غالب نظر آتا ہے۔
- اختر شیرانی نے خواتین اور بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی نظموں میں نفسیاتی پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔
- اختر شیرانی کی نظمیں اردو کی رومانوی شاعری کی سب سے بہترین نظمیں قرار دی جاتی ہیں اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے اختر شیرانی کو نظم کی شاعری میں انفرادی مقام حاصل ہے۔
- اختر شیرانی 1948ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر صرف 43 سال تھی۔
- اختر شیرانی کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" ترجیع بند کے فارم میں ہے جس میں چھ مصرعے ہیں۔ یہ نظم جملہ اٹھارہ بندوں پر مشتمل ہے۔

13.4 مشکل الفاظ

محور	مرکز، دھُری جس پر پہیہ گردش کرتا ہے	Axis, center
باضابطہ	طریقے سے	Properly, according to rules
منافقت	ظاہر و باطن میں فرق	Hypocrisy
ہیئت	بناوٹ، شکل	Structure, form, shape
ترسیل	پہنچانا، روانہ کرنا	Delivery, sending
تشنگی	پیاس	Thirst
ازالہ	زائل کرنا، مٹانا	Removal, elimination
شعار	طریقہ	Motto, method, slogan
ثقیل	بھاری	Heavy, serious

وارفتہ	فدا ہونا	Devoted, absorbed
مستعار	ادھار، مانگا ہوا	Borrowed, on loan
خول	اوپر کا غلاف	Outer shell, casing

13.5 مشقیں

مشق 1۔ خالی جگہ کو پُر کیجیے۔

I. اختر شیرانی کا پورا نام محمد..........................تھا۔

II. اختر شیرانی کا انتقال 1948ء میں..............................ہوا۔

III. اختر شیرانی ....بے حد مقبول شاعر تھے۔

IV. کیا اب بھی وہاں برسات کے دن.. آتی ہیں۔

مشق 2۔ نیچے دیے گئے الفاظ کے معنی لکھیے اور ان کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

نظارے : ....

سپنے : ....

ریوڑ : ....

کھنڈر : ....

احباب : ....

گھنگھور : ....

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

13.6.1 معروضی سوالات:

1۔ اختر شیرانی کا پورا نام کیا تھا؟

(a) محمد داؤد خان (b) سعادت خان (c) احمد خان (d) مسعود خان

2۔ اختر شیرانی کے والد کا نام بتائیے؟

(a) محمد داؤد خان (b) سلیم خان (c) عظیم خان (d) حافظ محمود شیرانی

3۔ اختر شیرانی کس سنہ میں پیدا ہوئے؟

(a) 1908 (b) 1905 (c) 1910 (d) 1911

4۔ اختر شیرانی کے کتنے شعری مجموعے شائع ہوئے؟

(a) دو (b) تین (c) پانچ (d) آٹھ

5۔ کون سا شعری مجموعہ اختر شیرانی کا نہیں ہے؟

(a) اخترستان (b) روپ (c) شعرستان (d) صبح بہار

6۔ نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کس ہیئت میں ہے؟

(a) ترکیب بند (b) ترجیع بند (c) مستزاد (d) مثنوی

7۔ یہ نظم کتنے بند پر مشتمل ہے؟

(a) 20 (b) 22 (c) 18 (d) 16

8۔ تشنگی کے کیا معنی ہیں؟

(a) پیاس (b) بھوک (c) بیماری (d) خوشی

9۔ انتقال کے وقت اختر شیرانی عمر کتنے برس تھی؟

(a) 50 (b) 60 (c) 43 (d) 45

10۔ اختر شیرانی نے کس شہر میں وفات پائی؟

(a) لاہور (b) کراچی (c) اسلام آباد (d) سیال کوٹ

13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. اختر شیرانی کے مجموعہ کلام کا تعارف پیش کیجیے۔
2. اختر شیرانی نے اس نظم میں گاؤں کی برسات کس طرح ذکر کیا ہے۔ اپنے لفظوں میں لکھیے۔
3. ان اشعار کی تشریح کیجیے۔

کیا اب بھی مہکتے مندر سے
ناقوس کی آواز آتی ہے
کیا اب بھی مقدس مسجد پر
مستانہ اذاں تھراتی ہے
اور شام کے رنگیں سایوں پر
عظمت کی جھلک چھا جاتی ہے
او دیس سے آنے والے بتا

4. اس نظم کا پسندیدہ شعر لکھ کر اس کا مطلب بیان کیجیے۔
5. اختر شیرانی بچوں اور عورتوں کے لیے جو مجموعہ لکھا ہے۔ اس کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔

13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اختر شیرانی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کا تجزیہ کیجیے۔
3. اختر شیرانی کی نظم نگاری پر ایک نوٹ لکھیے۔

13.6.1 کے جوابات:

B	(v)	D	(iv)	B	(iii)	D	(ii)	A	(i)
A	(x)	C	(ix)	A	(viii)	C	(vii)	B	(vi)

اکائی 14: نظم

نیا شوالہ (اقبال)، ملاقات (فیض)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید
14.1 مقاصد
14.2 نظم: نیا شوالہ (اقبال)
14.2.1 اقبال کا تعارف
14.2.2 نظم "نیا شوالہ"
14.2.3 "نیا شوالہ" کی تشریح
14.2.4 مشکل الفاظ
14.2.5 مشقیں
14.3 نظم "ملاقات" (فیض)
14.3.1 فیض احمد فیض کا تعارف
14.3.2 نظم "ملاقات"
14.3.3 "ملاقات" کی تشریح
14.4 اکتسابی نتائج
14.5 مشکل الفاظ
14.6 مشقیں
14.7 نمونۂ امتحانی سوالات

14.0 تمہید

پچھلی اکائی میں آپ نے اختر شیرانی کی نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ اس اکائی میں آپ اقبال اور فیض کی نظموں کا مطالعہ کریں گے۔

اردو نظم نگاری میں اقبال اور فیض احمد فیض اپنی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ اقبال کی نظم "شوالہ" اور فیض احمد فیض کی نظم "ملاقات کا مطالعہ کرنے سے آپ کو ان کی نظم نگاری کا اندازہ ہو جائے گا۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- علامہ اقبال کے حالات زندگی سے واقف ہو سکیں۔
- نظم ''نیاشوالہ'' کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم ''نیاشوالہ ''کا خلاصہ بیان کر سکیں۔
- فیض احمد فیض کے بارے میں جان سکیں۔
- نظم ''ملاقات'' کے منتخب متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم ''ملاقات'' کے مفاہیم پر روشنی ڈال سکیں۔

14.2 نظم: نیاشوالہ (اقبال)

14.2.1 اقبال کا تعارف:

اقبال کی پیدائش 9نومبر 1877 کو سیالکوٹ میں ہوئی۔ اقبال کا پورانام شیخ محمد اقبال اور تخلص اقبال تھا۔ اقبال کو حکیم الامت اور شاعر مشرق جیسے القاب سے بھی نوازا گیا۔ ان کا تعلق ایک کشمیری برہمن خاندان سے تھا۔ ان کے اجداد میں باباصالح نے سترہویں صدی میں اسلام قبول کر لیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکتب 'عمر شاہ' میں ہوئی اس کے بعد ان کا داخلہ سیال کوٹ کے اسکاچ مشن اسکول میں ہوا۔ انہوں نے 1893 میں ہائی اسکول اور 1895 میں انٹر کا امتحان پاس کیا۔ 1897 میں لاہور کے ہی گورنمنٹ کالج سے بی۔ اے اوراسی کالج سے 1899 میں فلسفہ میں ایم۔اے۔ پاس کیا۔ ایم۔اے میں ان کے استاد پروفیسر آرنلڈ تھے جس سے اقبال نہایت متاثر تھے۔ انہوں نے اپنی نظم ''نالہ فراق'' انہیں کی یاد میں کہی ہے۔ اپنی تعلیم پوری کر کے اقبال اسی کالج میں درس وتدریس کی خدمات انجام دینے لگے۔ اس کے بعد اعلی تعلیم کی غرض سے 1905 میں یورپ کارخ کیا۔ میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر 1908 میں ااقبال واپس ہندوستان آ گئے۔ 1923 میں حکومت نے انہیں سر کے خطاب سے نوازا۔ علامہ اقبال کو مختلف جامعات سے ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگریوں سے بھی نوازا گیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے 1929 میں، پنجاب یونیورسٹی نے 1933 میں، ڈھاکہ یونیورسٹی نے 1934 میں، الہ آباد یونیورسٹی نے 1937 میں اور عثمانیہ یونیورسٹی نے 1938 میں انہیں ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا گیا۔

علامہ اقبال اردوزبان کے ایک عظیم شاعر تھے۔ انہوں نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزلیں بھی کہیں ہیں مگر نظم نگاری کی وجہ سے وہ کافی مشہور ہوئے۔ اپنی شاعری کے ذریعہ انہوں نے قوم کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ علامہ اقبال نے شعر گوئی کا آغاز پنجابی میں کیا مگر ان کے استاد مولوی میر حسن نے انہیں اردو میں شعر کہنے کا مشورہ دیا تو اردو میں شعر کہنے گے اور مشاعروں اور جلسوں میں بھی شریک ہونے لگے۔ ''نالہ یتیم'' ان کی ابتدائی نظم ہے جس سے انھیں کافی شہرت ملی۔ اس کے بعد انہوں نے باقاعدہ نظم نگاری کا آغاز کیا۔ ان کی پہلی نظم ''ہمالہ'' ہے۔ ان کی ابتدائی نظموں میں ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، ترانۂ ہندی اور جگنو وغیرہ خاص ہیں۔ جب اقبال نے شعر کہنا شروع کیا تو ہمارا ملک ہندوستان مختلف مسائل سے دوچار تھا۔ انگریزوں کے ظلم وبربریت سے ہندوستانی عوام میں بے

بسی اور مایوسی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی چنانچہ لوگوں کو ان کیفیات سے نکالنے کے لیے اقبال نے قومی اور وطنی نظمیں لکھیں ان کی اس ابتدائی دور کی شاعری کو ان کی شاعری کا پہلا دور کہا جاتا ہے۔

1905 سے 1908 کی شاعری کا وہ دور ہے جب علامہ اقبال یورپ میں مقیم تھے۔اس دور کی شاعری کو ان کے دوسرے دور میں رکھا گیا ہے۔اقبال کو پیامی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔یورپ کے سفر کے بعد کی شاعری کو ان کی شاعری کا تیسرا دور مانا جاتا ہے۔انہوں نے انگریزوں اور ان کی پالیسیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ مسلمان احساس کمتری کا شکار تھے اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ ان میں ماضی کی یاد تازہ کی اور ان کی خودی کو ابھارا۔ سفر یورپ کے بعد اقبال کے فلسفیانہ خیالات میں بڑی وسعت آئی۔ان کے کلام میں خودی کا فلسفہ غالب ہے۔اسی لیے انھیں فلسفی شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ان کا انتقال لاہور میں 21 اپریل 1938 کو ہوا۔

14.2.2 نظم " نیا شوالہ " :

(i)

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

(ii)

تنگ آ کے میں نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

(iii)

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقش دوئی مٹادیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیش میں بنا دیں

(iv)

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
داما ن آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

(v)

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

14.2.3 ''نیاشوالہ'' کی تشریح:

علامہ اقبال کا شمار اردو کے عظیم نظم نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو نظم کو نیالب ولہجہ عطا کیا ہے۔ان کی نظموں میں خاص فکر اور گہرا فلسفہ پایا جاتا ہے۔اردو میں اقبال کے چار شعری مجموعے ہیں جن کے نام ترتیب وار یہ ہیں۔''بانگ درا'' (1924)، ''بال جبریل(1934)''ضرب کلیم (1936)''ارمغان حجاز(1938)'' میں شائع ہوئے۔علامہ اقبال کی یہ نظم ''نیاشوالہ'' ان کے شعری مجموعہ ''بانگ درا'' میں شامل ہے۔یہ نظم لاہور سے نکلنے والے رسالہ ''مخزن'' میں 1905 میں پہلی بار چھپی۔یہ اس دور کی بات ہے جب کہ اقبال اپنی شاعری کے ذریعے عوام کو حب الوطنی اور قومی یکجہتی کا پیغام دے رہے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے تعلیم یافتہ اور باشعور لوگ بلکہ ہندوستان کے تمام باشندے اپنے دلوں میں حب الوطنی کے جذبے کی کسک محسوس کرنے لگے۔ہندوستانی قومیت کی سب بڑی خاص بات یہ تھی کہ سیاسی و معاشی محرکات کے پیش نظر مختلف قومیں مختلف زمانوں میں ہندوستان آتی گئیں اور یہیں بستی چلی گئیں ان مختلف مذاہب اور قوموں کے ایک ساتھ رہنے سہنے سے ہندوستانی قومیت کو تقویت ملی۔علامہ اقبال نے ''نیاشوالہ'' میں اس بھائی چارہ اور کثرت میں وحدت کے تصور کو بہت ہی مؤثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔یہ نظم ہندو مسلم اتحاد کی پر اثر تعلیم دیتی ہے۔علامہ اقبال کی یہ خواہش تھی کہ ہندوستان میں بسنے والے تمام لوگ بھلے ہی وہ الگ الگ مذہب اور عقیدے کے کیوں نہ ہوں، اپنے مذہبی عقائد کو ایک طرف رکھ دیں۔یہاں نہ کوئی ہندو رہے نہ مسلمان اور نہ ہی سکھ بلکہ سب متحد ہو کر ایک ہندوستانی بن جائیں۔

اس نظم میں علامہ اقبال برہمن سے مکالمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر تو برا نہ مانے تو میں اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا ہوں ایک ایسی حقیقت جو کہ کڑوی ضرور ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ تو صدیوں سے جن بتوں کی پرستش کرتا آرہا ہے وہ بالکل پرانے ہو چکے ہیں اور اس نئے دور میں ان کی حیثیت نہ کے برابر ہو کر رہ گئی ہے۔ان بتوں کی پرستش نے تجھے انسانوں ہی سے نفرت کرنا سکھایا ہے۔اے برہمن صرف تو ہی اس لعنت میں ملوث نہیں ہے بلکہ واعظ کا بھی حال بالکل تیرے ہی جیسا ہے۔واعظ بھی فرقہ پرستی اور لڑائی جھگڑے میں مشغول ہے۔شاعر کہتا ہے کہ یہ سب دیکھ کر میں نے کعبہ اور بت خانہ دونوں کو ترک کر دیا ہے۔میں واعظ کا بھی وعظ نہیں سنتا اور نہ ہی تیرے اشلوک سنتا ہوں۔مجھے تو اپنے وطن کے ہر ذرے میں دیوتا دکھائی دیتا ہے۔اس لیے مجھے یہاں کے ہر ذرے سے پیار

ہے۔

علامہ اقبال ہندووں اور مسلمانوں کی مذہبی انتہاپسندی سے پریشان نظر آتے ہیں کہ یہ لوگ اپنے مذہب کی وجہ سے ہی ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ جس سے نجات کا وہ ایک ہی حل بتاتے ہیں وہ حل ہے اتحادواتفاق کا۔ وہ چاہتے ہیں ک ہندوستان ایسا وطن بنے جو کہ اتفاق کی بنیاد پر قائم ہو جس میں ہندو مسلم دونوں قوم متحد رہیں دونوں کا مقصد بھی ایک ہی ہو اگرچہ ان دونوں کے مذاہب مختلف ہیں اور بھلے ہی وہ مذہب میں ایک نہیں ہوسکتے مگر اس وطن کے لیے ہی ایک ہو جائیں۔ اسی میں ہندوستانیوں کی بھلائی ہے اور اسی اتحاد میں ان کی ترقی کی راہ پوشیدہ ہے۔

نظم کے اگلے حصے میں اقبال کہتے ہیں کہ اے برہمن؛ چلو ہم دونوں مل کر ایک بار پھر سے نفاق اور تفرقہ کو مٹادیں اوراپنے وطن کے لوگوں کے دلوں میں جو نفرت اور نفاق کا بیج پنپ رہاہے اس کو مٹاکر ان کے اندر اتحادواتفاق کا جذبہ پیدا کیاجائے تاکہ بچھڑے ہوئے دل آپس میں پھر مل جائیں۔ باہمی نفرت کے باعث لوگوں کے دلوں کی بستیاں اجڑ چکی ہیں۔ اے برہمن آ ان دلوں میں ایک نئے مندر کی بنیاد رکھیں۔ ایسا مندر جو کہ مرتبے میں تمام عبادت گاہوں سے اونچا، بلند وبالا ہو۔ اس میں سب لوگ مل جل کر محبت کے میٹھے میٹھے نغمے گائیں اور تمام ہندوستانیوں کے دلوں میں محبت اور بھائی چارہ کی فضا پیدا کریں۔

اقبال چاہتے ہیں کہ ملک کی شکل میں ایک ایسا نیاشوالہ بنالیاجائے جو دنیا کی تمام عبادت گاہوں سے بلند وبالا ہو جس میں ہندو مسلم متحد ہو کر صرف اور صرف پیار و محبت کے گیت گائیں اور سنائیں اسی سے اس سرزمین ہند والوں کو شانتی مل سکے گی اوراہل ہند ترقی کی راہ پر چل کر آگے بڑھ سکیں گے۔

14.2.4 مشکل الفاظ:

شوالہ	مہادیو کا مندَر، بڑے دیوتا کا مندَر	Temple of a deity
برہمن	ہندوؤں کا مذہبی رہنما	Hindu religious leader / Brahmin
صنم کدہ	بت خانہ	Idol house / Idol temple
واعظ	نصیحت کرنے والا، مسلمانوں کا مذہبی رہنما	Preacher, religious instructor
بیر	دشمنی	Enemy, hostility
جنگ وجدل	لڑائی، جھگڑا	Fight, conflict, dispute
دیر	بت خانہ	Monastery / Temple
حرم	کعبہ	Sacred place, sanctuary / Kaaba
خاک وطن	وطن کی مٹی	Native soil, homeland
نقش دوئی	دو ہونے کا نشان	Double mark, twin imprint
تیرتھ	ہندوؤں کی مقدس عبادت گاہ	Sacred place of worship (Hindu)
کلس	مسجد کا گنبد / گنبد کا اوپری حصہ	Dome of a mosque / top part of dome

مے	شراب	Wine, alcohol
پیت	پیار، محبت	Love, affection
مکتی	چھٹکارا، نجات	Salvation, liberation
دامن آسماں	آسمان کا دامن	Skirt of the sky / Horizon
دیوتا	خدا کا اوتار	Deity, god
شکتی	طاقت	Power, strength
باسی	باشندہ	Inhabitant, resident
بھگت	عقیدت مند	Devotee, worshipper
متحد	متفق، یکجا	United, joined together
سونی	ویران	Deserted, barren
شانتی	امن، سکون، آرام	Peace, tranquility
ہمہ وقت	ہمیشہ، تمام وقت	Always, all the time

14.2.5 مشقیں:

مشق 1: صحیح جملوں کے سامنے (☑) اور غلط کے آگے (☒) کا نشان لگائیں۔

1۔ ”نیا شوالہ“ علامہ اقبال کے شعری مجموعہ ’بانگ درا‘ میں شامل ہے۔ ( )

2۔ ”نیا شوالہ“ لاہور سے نکلنے والے رسالہ ”مخزن“ میں 1905 میں پہلی بار چھپی۔ ( )

3۔ علامہ اقبال نے اپنی نظم ”نالہ فراق“ اپنے استاد میر حسن کی یاد میں کہی ہے۔ ( )

4۔ علامہ اقبال کی شاعری کو پانچ ادوار میں بانٹا گیا ہے۔ ( )

5۔ علامہ اقبال کی پہلی نظم ”نالہ یتیم“ ہے۔ ( )

مشق 2: دیے گئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ بیر : ....

2۔ دیر و حرم : ....

3۔ خاک وطن: ....

4۔ واعظ : ....

5۔ باسی : ....

6.3 نظم: ملاقات (فیض)

14.3.1 فیض احمد فیض کا تعارف:

فیض احمد فیض کی پیدائش 13 فروری 1911 میں سیالکوٹ میں ہوئی۔ فیض کے والد کا نام سلطان محمد خان تھا۔ ان کے والد سیالکوٹ کے مشہور بیرسٹر تھے۔ فیض کا شمار اردو کے صف اول کے شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی شہرت ایک شاعر، صحافی، مصنف، انقلابی شاعر اور نغمہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ فیض نے 1927 میں اسکاچ مشن ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ یہ سیالکوٹ کا بہترین اسکول تھا اسی اسکول سے دو سال بعد ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم حاصل کے لیے لاہور آگئے۔ ابھی فیض گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا جس کی وجہ سے انہیں کئی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا مگر فیض نے کسی بھی طرح اپنے تعلیمی سلسلے کو منقطع نہیں ہونے دیا۔ گورنمنٹ کالج میں داخلہ کے بعد ان کی سخن گوئی کو اور بھی شہرت ملی۔ وہاں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور پطرس بخاری جیسے اساتذہ کی رہنمائی ملی۔ فیض اپنے زمانہ طالب علمی سے ہی شعر کہنے لگے تھے۔ اس کالج میں 1931 میں مشاعرہ منعقد ہوا تو اس مشاعرے میں فیض نے بھی "اقبال" کے موضوع پر اشعار پڑھے۔ ان کے کلام کو کافی سراہا گیا اور یہ نظم " راوی" (جو کہ ان کے کالج کا میگزین تھا) میں شائع ہوئی۔ اس مجلہ میں فیض کی کئی نظمیں چھپیں جن میں سے کچھ نظمیں ان کے پہلے مجموعہ کلام "نقش فریادی" میں بھی شامل ہیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے ہی فیض نے 1931 میں بی۔ اے۔ اور عربی ادب میں بی۔ اے۔ آنرز کی بھی ڈگری حاصل کر لی۔ پھر انگریزی ادب میں ایم۔ اے 1933 میں پاس کیا پھر 1934 میں عربی ادب میں امتیازی نمبرات سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ فیض اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان جانا چاہتے تھے مگر حالات نے ساتھ نہیں دیا۔ فیض نوکری کی تلاش میں پریشان تھے۔ 1934 کے قریب امرتسر کے ایم۔ اے۔ او ہائی اسکول کو کالج کا درجہ مل گیا جس میں نئے اسٹاف کی ضرورت تھی لہذا 1935 میں اس کالج میں فیض کو لیکچرار کی جگہ مل گئی وہ اس کالج سے پانچ سال تک منسلک رہے۔ اسی دوران انہوں نے سیاست میں دلچسپی لینی شروع کر دی اور 1938 میں لاہور سے شائع ہونے والے پرچے "ادب لطیف" کی ادارت کی۔ اس کے بعد انھوں نے " پاکستان ٹائمز' امروز اور لوٹس کی ادارت کی۔

امرتسر ہی میں فیض کی ملاقات سجاد ظہیر سے ہوئی جو کہ ترقی پسند تحریک کے بانی تھے۔ فیض ان کے خیالات سے متاثر ہوئے۔ سجاد ظہیر سے ملاقات کے بعد لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کرنے کی ذمہ داری فیض نے اپنے سر لے لی۔ وہ 1936 میں ترقی پسند تحریک کی پنجاب شاخ کے بانی رکن و سکریٹری بنائے گئے۔

فیض کی شاعری کا آغاز رومانی شاعری سے ہوا کیونکہ اس دور میں جب اردو شاعری میں رومانی رجحان عروج پر تھا۔ فیض اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری کی رومانی شاعری سے نہایت متاثر تھے اس لیے ان کی ابتدائی شاعری پر رومانیت غالب تھی پھر دھیرے دھیرے ترقی پسند شاعری کے موضوعات شامل ہوتے گئے۔ فیض کی شاعری میں فطری مناظر کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری میں عاشقی کی فضا بھی خوب ہے۔ فطرت اور حسن و عشق کی شاعری کے بعد وہ انقلابی شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ اسی لیے ان کی شاعری کو حسن و عشق اور انقلاب کا سنگم کہا جاتا ہے۔ فیض کے آٹھ شعری مجموعے "نقش فریادی" (1941)، "دست صبا" (1952)، "زنداں نامہ" (1956)، "دست تہہ سنگ" (1956)، "سر وادی سینا" (1971)، "شام شہر یاراں" (1978) اور "میرے دل میرے مسافر" (1981) اور آخری مجموعہ "غبار ایام" شائع ہوئے۔ ان سب شعری مجموعوں کو اکٹھا کر کے

''نسخہ ہائے وفا''(کلیات) کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ اسی طرح نثری ادب میں بھی ان کے قابل قدر کارنامے ہیں۔ جیسے ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ '' میزان'' 1963 میں، خطوط کا مجموعہ '' صلیبیں میرے دریچے میں''1972 میں، سفر نامہ '' سفر نامہ کیوبا'' 1974 میں شائع ہوئے۔ اس کے علاوہ '' متاع لوح و قلم، مہ و سال آشنائی اور قرض دوستاں بھی ان کی نثری خدمات کا مجموعہ ہیں۔

فیض کی کچھ نظمیں جیسے ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' ، ''تنہائی''،''سرود شبانہ''،''میرے معصوم قاتل''،''صبح آزادی''،''انتظار''،''شیشوں کے مسیحا''،''زنداں کی ایک شام''،نثار میں تیری گلیوں کے''اور''اے روشنی کے شہر''وغیرہ کافی مشہور ہیں۔''دست صبا''اور''زنداں نامہ''کی زیادہ تر شاعری ان چار سالوں کے دوران لکھی گئی جب کہ وہ1951 میں راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہو کر قید تھے۔''دست صبا''میں اسیری کے دوران کی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں ''سیاسی لیڈر کے نام''اور''صبح آزادی''زیادہ مشہور ہیں۔

فیض دمہ کی بیماری میں مبتلا تھے۔ لاہور میں وہ زیر علاج تھے۔ آخری ایام میں انہوں نے سگریٹ نوشی بھی چھوڑ دی مگر دمہ کی بیماری سے چھٹکارا نہ پا سکے بالآخر 20نومبر 1984 میں لاہور میں ہی اس دار فانی کو الوداع کہہ گئے۔

14.3.2 نظم ''ملاقات'':

(i)

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا نور رو گئے ہیں

(ii)

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے

یہ چند قطرے تری جبیں پر
برس کے ہیرے پرو گئے ہیں

(iii)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہر خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موج زر جو تری نظر ہے

(iv)

وہ غم جو اس وقت تیری بانہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے
ہر ایک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(v)

الم نصیبوں جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں

کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

14.3.3 نظم ''ملاقات'' کی تشریح:

فیض ایک مخصوص سیاسی مسلک کے شاعر تھے ان کی ادبی و شعری سرگرمیاں کم و بیش نصف صدی پر محیط ہیں۔ اس دوران ان کے آٹھ مجموعہ کلام شائع ہوئے فیض کی شناخت کئی حوالوں سے ہوتی ہے۔ کبھی ان کی پہچان رومانیت اور حقیقت پسندی کے دوراہے پر کھڑے شاعر کی حیثیت سے ہوتی ہے تو کبھی ان کی شناخت کلاسیکی علامتوں اور استعاروں کو معاصر صورت حال اور سیاسی معنوں سے ہم آہنگ کرنے والے فن کار کے طور پر کی گئی۔ اور کبھی ان کو ترقی پسند فکر اور جمالیات کو ہم آمیز کرنے والے ممتاز شاعر کے طور پر جانا گیا۔ فیض ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر فیض نے جس طرح نظم نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں جو کامیابی حاصل کی وہ کسی اور شاعر کے حصے میں بمشکل ملے گی۔ جن شعرا نے اپنی نظموں کے ذریعہ ترقی پسند تحریک کو قوت بخشی ان میں مجروح سلطان پوری، جذبی، سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین، وامق جونپوری، مجاز وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ ترقی پسند شعرا نے اپنی زندگی کے حالات، اپنے مسائل اور اپنا ذاتی کرب بیان کرنے کے بجائے بے بس، غریب اور مجبور لوگوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ فیض کی نظم ''ملاقات'' بھی اسی ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھی گئی ایک اہم نظم ہے۔ یہ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس نظم کے پیرایہ اظہار کے اہم عناصر استعارے اور امیجری ہیں۔

پہلے بند میں شاعر نے رات جو کہ ظلم کا حصہ ہے اسے درد کا شجر قرار دیا ہے۔ فیض کا جو روایتی اور انقلابی انداز تھا وہ اس نظم میں نہیں ملتا۔ یہ نظم امیجری کی عمدہ مثال ہے۔ اس میں فیض نے جمالیات کو انقلاب سے اور انقلاب کو جمالیات سے جدا نہیں ہونے دیا ہے۔ اس نظم کو پڑھتے وقت ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاعر نے رات کو ظلم و بے انصافی اور درد و غم کے استعارے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس نظم میں کہیں بھی شاعر کا محبوب نظر نہیں آتا۔ شاعر نے رات کو درد کا شجر کہا ہے بلکہ اس میں انسان کا درد اور انسانیت جھلک رہی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ظلم کی رات ہی عظیم تر ہے۔ رات، درد اور شجر پرانے الفاظ ہیں مگر رات کو درد کا شجر کہنا اس میں ایک نئی ندرت پیدا کر دیتا ہے۔ رات کے شجر، ستاروں کے کارواں اور مہتاب سے مل کر جو امیجری بنی ہے وہ بہت ہے پر کیف ہے۔ اس میں شاعر نے رات، شجر، مشعل، ستارے، مہتاب اور نور کی امیجری کو بڑے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اس میں ستاروں کے کارواں کا کھو جانا اور مہتاب کا اپنا نور رو جانا وغیرہ کو شاعر نے بطور استعارہ استعمال کیا ہے جو کہ درد کی کسک کو ظاہر کرتا ہے۔ درد کو مجھ سے اور تجھ سے عظیم تر کہنا انسانیت کی طرف اشارہ ہے۔

دوسرے بند میں شاعر نے رات کو ظلم کے استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے ذریعہ شاعر روشنی اور امید کا پیغام دے

رہاہے کہ جیسے رات کے بعد سحر کا اور تاریکی کے بعد روشنی کا آنا لازمی ہے ویسے ہی ظلم کے بعد امن کا آنا یقیناً لازمی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے خوب صورت پیکر تراشی اور تازہ

جابجا امیجری کا استعمال کر کے اس کے معنیاتی استعاروں کے ذریعہ اس نظم کی ندرت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ اس میں گیسو، گلنار، شبنم ،قطرے، جبین اور ہیرے وغیرہ یہ سب اردو کے کلاسیکی اور روایتی الفاظ ہیں مگر ان الفاظ کو نئے معنیٰ میں استعمال کر کے شاعر نے اس نظم کی ندرت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس میں فیض نے ظلم کی رات کو درد کا شجر قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ ظلم کی یہ رات بہت ہی عظیم ہے کیوں کہ اس رات کے طویل ہونے اور بڑھنے کے نتیجے میں بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوتی ہیں یعنی جب بھی ظلم حد سے گزر تا ہے تو بڑے رہنما ہمارے سامنے ابھر کر آتے ہیں۔ یہاں شاعر پر امید ہے کہ ظلم کی جو رات ہے اس کے بعد ایسی سحر آئے گی جو ظلم کی تاریکی کو ختم کر دے گی۔ اسی سے اس رات کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے اور تجھ سے عظیم تر ہے۔ استعاراتی بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ یہ ظلم کی رات بہت کالی ہے جس میں شاعر کی صدا نہر خون میں موجزن ہے۔ شاعر نے تلمیح بیان کی ہے۔ اس نظم میں شاعر اپنا المیہ بیان کر رہا ہے اور نہایت دلنشیں پیرائے میں اپنے احساسات کو بیان کر رہا ہے اور دوسرا کردار محض سن رہا ہے اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا۔ رات بنیادی علامت ہے اور ملاقات کو بیان کرنے کے لیے رات سب سے بہتر علامت ہے ساتھ ہی ظلم کو بیان کرنے کے لیے بھی رات موزوں ترین علامت ہے۔

تیسرے بند میں شاعر رات کی تاریکی کا ذکر کرتے ہوئے ظلم اور جبر کے دور میں امید کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ کہیں سحر کا، آفتاب کا، ستاروں اور موج زر وغیرہ کا ذکر کرتا ہے کہ یہ تمام چیزیں کہیں نہ کہیں رات کے ظلم کو ختم کرنے کا باعث بنیں گی کیوں کہ رات کے بعد صبح کا آنا لازمی ہے۔ یہ رات اور صبح کی ملاقات ہے، یقین اور امید کی ملاقات ہے کہ رات کے بعد تو سحر ہونی ہی ہے اس لیے شاعر کہیں ہیرے پرو رہا ہے تو کہیں پر موج زر کو نظر کا نام دے رہا ہے اور کہیں رات کے شجر کو عظیم تر بتا رہا ہے اور اس کو یقین سے جوڑ رہا ہے کہتا ہے کہ اس ظلم کی وجہ سے میرے دل پر جو واردات گزری ہے جس کی وجہ سے میں غمگین ہوں۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر رات نہ ہوتی تو غم نہ ہوتا اور غم نہ ہوتا تو سحر کا یقین بھی نہ ہوتا ظلم آیا اور رات چھائی ہوئی ہے تو صبح کا یقین ہے کہ رات ختم ہو گی تو صبح آئے گی۔ یہ ایک ایسا یقین ہے جو غم سے کریم تر ہے، غم سے پیارا ہے اس کے بعد جو سحر آنے والی ہے وہ سب سے عظیم تر ہے۔ اس ظلم کی مدت میں اگر کچھ نجات دہندہ ہستیاں پیدا ہوں گی تو ان کے افکار و نظریات کو جلا ملے گی۔ اس لیے یہ رات اہم ہے۔

14.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- علامہ اقبال کی پیدائش 9 نومبر 1877 میں سیالکوٹ میں ہوئی اور انتقال 21 اپریل 1938 میں لاہور میں ہوا۔ ان کا پورا نام شیخ محمد اقبال تھا۔ والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ ان کے اجداد کشمیری برہمن تھے۔ علامہ اقبال کے دادا شیخ رفیق 1857 کے ہنگاموں کے بعد سیالکوٹ چلے آئے بعد میں خاندان کے دوسرے افراد بھی یہیں آکر رہنے لگے۔

- اقبال کی ابتدائی تعلیم مکتبہ عمر شاہ، محلہ شوالہ، سیالکوٹ میں ہوئی۔ 1883 میں اسکاچ مشن اسکول، سیالکوٹ میں داخلہ لیا اور 1893 میں میٹرک درجہ اول میں پاس کیا۔ 1895 میں انٹر میڈیٹ، 1897 میں لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی، اے۔ اور 1899 میں ایم۔ اے۔ کی پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے وہ 1905 میں یورپ چلے گئے۔
- 1907 میں " ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا" کے عنوان سے انگریزی میں مقالہ لکھ کر جرمنی کے میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگی حاصل کی۔ 1908 میں بیر سٹری کا امتحان پاس کر کے بار ایٹ لا کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے کچھ دنوں بعد اسی سال ہندوستان واپس آ گئے۔
- علامہ اقبال کو 1923 میں سر کا خطاب ملا۔ اس کے علاوہ مختلف جامعات نے ڈی۔ لٹ۔ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ جن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ جیسے بڑے ادارے شامل ہیں۔
- فیض احمد فیض 13 فروری 1911 میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے آٹھ شعری مجموعے ہیں۔ جن کے نام بالترتیب یوں ہیں۔ نقش فریادی، (1941) دست صبا (1952) زنداں نامہ (1956) دست تہہ سنگ (1956) سر وادی سینا (1971) شام شہر یاراں (1978) میرے دل میرے مسافر (1981) اور آخری مجموعہ غبار ایام ہے۔ ان سب مجموعوں کو اکٹھا کر کے کلیات کی شکل میں " نسخہ ہائے وفا" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔
- فیض کی مشہور نظم " ملاقات" ہے۔ جس میں فیض نے ظلم کو رات سے تشبیہ دی ہے جس طرح رات کے بعد صبح نمودار ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ظلم کے بعد آزادی کا سورج نکلے گا۔

14.5 مشکل الفاظ:

Eloquence, skill in poetry or speech	شاعری کا فن، شاعری کی مہارت	سخن گوئی
Tree	درخت، پیڑ	شجر
Torch, thick candle made of cotton or wax	جلنے والی روئی یا موم کی بنی ہوئی موٹی بتی	مشعل
On the palm of the hand	ہتھیلی پر	بکف
Moon, moonlight	چاند، چاندنی	مہتاب
Pomegranate flower	انار کا پھول	گلنار
Dew, moisture falling at night	اوس، رات کو گرنے والی نمی	شبنم
Forehead	پیشانی	جبین
Black, dark, gloomy	کالا، غمگین	سیہ
Sound, echo	آواز، بازگشت، گونج	صدا
Famous personalities	مشہور لوگ	نامور ہستیاں

گلستاں	باغ، گلزار، چمن	Garden, flower garden
ثمر	پھل	Fruit
شرر	چنگاری	Spark
تیشہ	کلہاڑی، ایک آلہ جس سے سنگ تراش پتھر کاٹتے ہیں	Axe, a tool used for cutting stones
الم نصیب	وہ جس کی قسمت میں غم ہے	One whose fate has sorrow, unlucky
جگر فگاروں	شکستہ دل، غمگین، پریشان	Broken-hearted, sad, distressed
افلاک	فلک کی جمع، آسمان	Heavens, sky (plural of Falak)
شفق	وہ سرخی جو طلوع آفتاب یا غروب آفتاب کے وقت افق پر نمودار ہوتی ہے	Reddish glow at sunrise or sunset
عظیم	عظمت والا، بہت بڑا	Great, large, mighty
آتشیں ہار	آگ کا ہار، آگ جیسا ہار	Fiery necklace, necklace like fire
محیط	چھایا ہوا	Surrounded, encompassed
ہم آمیز	ایک دوسرے سے ملنے والا، ایک جگہ ہونے کی کیفیت	Mixing together, combined
ندرت	نیاپن، اچھوتاپن، جدت	Novelty, uniqueness, freshness
معدوم	مٹایا گیا، غیر موجود، گم ہونا	Erased, non-existent, lost
افکار	خیالات، نظریات	Thoughts, ideas, philosophies
کریم	بزرگ، نیک، سخی	Noble, generous, benevolent

14.6 مشقیں

مشق 1: اقتباسات اور خلاصے کی مدد سے خالی جگہ کو پر کیجیے۔

1۔ ہزار مہتاب اس کے سائے...

2۔ فیض احمد فیض...کے بعد اردو کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں۔

3۔ فیض اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے...جانا چاہتے تھے مگر حالات نے ساتھ نہیں دیا۔

4۔ فیض.......................................اور...کی رومانی شاعری سے کافی متاثر تھے۔

5۔ فیض ایک مخصوص سیاسی مسلک کے شاعر تھے ان کی ادبی و شعری سرگرمیاں کم و بیش.......................پر محیط ہیں۔

مشق 2: نیچے دیے گئے الفاظ کی ضد لکھیے۔

1۔ مہتاب : ....

2۔ درد : ....

3۔ جبین : ....

4۔ شبنم : ....

5۔ گلستاں : ....

14.7 نمونۂ امتحانی سوالات

14.7.1 معروضی سوالات:

(1) علامہ اقبال کی پیدائش کس سنہ میں ہوئی؟

(a) 1890 (b) 1900 (c) 1877 (d) 1870

(2) اقبال کا پورا نام کیا ہے؟

(a) شیخ عطا محمد (b) شیخ محمد اقبال (c) نور محمد (d) محمد صالح

(3) علامہ اقبال کی نظم "نیا شوالہ" ان کے کس مجموعہ کلام میں شامل ہے؟

(a) بال جبریل (b) ضرب کلیم (c) ارمغان حجاز (d) بانگ درا

(4) نظم "نیا شوالہ" کتنے بند پر مشتمل ہے؟

(a) چار (b) سات (c) دس (d) پانچ

(5) اقبال کا انتقال کس شہر میں ہوا؟

(a) لاہور (b) کشمیر (c) دہلی (d) کراچی

(6) فیض احمد فیض کہاں پیدا ہوئے؟

(a) آگرہ (b) راولپنڈی (c) امرت سر (d) سیال کوٹ

(7) فیض احمد فیض کس تحریک سے وابستہ تھے؟

(a) علی گڑھ تحریک (b) ترقی پسند تحریک (c) رومانی تحریک (d) خلافت تحریک

(8) نقش فریادی کس کا شعری مجموعہ ہے؟

(a) فیض (b) حالی (c) اقبال (d) جوش

(9) فیض کے کتنے شعری مجموعے ہیں؟

(a) آٹھ (b) سات (c) پانچ (d) دس

(10) فیض نے کس سنہ میں وفات پائی؟

(a) 1960 (b) 1984 (c) 1980 (d) 1990

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ علامہ اقبال کی حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ فیض احمد فیض کا تعارف پیش کیجیے۔

3۔ علامہ اقبال کی تخلیقات پر روشنی ڈالیے۔

4۔ اس رسالہ کا نام لکھیے جس میں "نیا شوالہ" پہلی مرتبہ شائع ہوئی؟

5۔ فیض نے "اقبال" کے موضوع پر جو اشعار کہے وہ کس مجلہ میں شائع ہوئے؟

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نظم "نیا شوالہ" کا خلاصہ پیش کیجیے۔

2۔ نظم "ملاقات" کا خلاصہ پیش کیجیے۔

3۔ علامہ اقبال کی شاعری کو کتنے دور میں بانٹا گیا ہے لکھیے۔

14.7.1 کے جوابات:

(i) C	(ii) B	(iii) D	(iv) D	(v) A
(vi) D	(vii) B	(viii) A	(ix) A	(x) B

اکائی 15: نظم

گرمی اور دیہاتی بازار (جوش)، رات اور ریل (مجاز)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 نظم: گرمی اور دیہاتی بازار (جوش)

15.2.1 جوشؔ کا تعارف

15.2.2 نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار''

15.2.3 نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کی تشریح

15.2.4 مشکل الفاظ

15.2.5 مشقیں

15.3 نظم ''رات اور ریل'' (مجاز)

15.3.1 مجاز کا تعارف

15.3.2 نظم ''رات اور ریل''

15.3.3 نظم ''رات اور ریل'' کی تشریح

15.3.4 مشکل الفاظ

15.3.5 مشقیں

15.4 اکتسابی نتائج

15.5 نمونۂ امتحانی سوالات

15.0 تمہید

گزشتہ اکائی میں آپ نے علامہ اقبال کی نظم '' نیاشوالہ'' اور فیض احمد فیض کی نظم ''ملاقات'' کا مطالعہ کیا۔ اس اکائی میں آپ مزید دو نظموں کا مطالعہ کریں گے۔ جن میں ایک جوشؔ کی نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' ہے اور دوسری مجاز کی نظم ''رات اور ریل'' ہے۔ ان دونوں نظموں کے تخلیق کاروں کا تعلق بنیادی طور پر ترقی پسند تحریک سے ہے۔ جن تحریکات ورجحانات نے اردو ادب پر سب سے زیادہ اور دیرپا اثرات ڈالے ان میں ترقی پسند تحریک کا نام سب سے پہلے لیا جاتا ہے۔ اس وقت کے تمام بڑے شعرا اور نثر نگاروں

نے اس تحریک کے مقاصد کی تائید کی اور اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جن میں فیض احمد فیض، معین احسن جذبی، مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی وغیرہ کے ساتھ ساتھ جوش اور مجاز کے نام بھی بہت اہم ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ جو شعرا ترقی پسند تحریک کے تحت شاعری کر رہے تھے وہ دوسرے موضوعات سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کیے ہوئے تھے۔ وہ ملک کے حالات، آزادیٔ وطن، غریبوں و مزدوروں کی حمایت کے ساتھ ساتھ فطری، رومانی اور دیگر موضوعات کو بھی اپنی تخلیق میں پیش کرتے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ان کی تعداد ترقی پسند موضوعات کے مقابلے میں کم ہوتی تھی۔ خود جوش ملیح آبادی کو شاعر انقلاب کے ساتھ ساتھ ''شاعر فطرت'' اور ''شاعر شباب'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح مجاز کو جنون کا شاعر کہا جاتا ہے اور ان کے یہاں بھی رومانی نظمیں بہت ہیں۔ اس اکائی میں شامل نظمیں منظر نگاری کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہیں جن کی تفصیلی وضاحت اگلے صفحات میں پیش کی جائے گی۔ آپ نہ صرف ان نظموں کی تشریح اور اس کے خلاصے کا مطالعہ کریں گے بلکہ نظم نگاروں کے سوانحی حالات سے بھی واقفیت حاصل کریں گے۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- جوش ملیح آبادی کی سوانحی اور ادبی زندگی سے واقف ہو سکیں۔
- نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کا خلاصہ کو بیان کر سکیں۔
- اسرار الحق مجاز کے حالات زندگی پر روشنی ڈال سکیں۔
- نظم ''رات اور ریل'' کے متن کا مطالعہ کر سکیں۔
- نظم ''رات اور ریل'' کا خلاصہ اور اس کا مفہوم بیان کر سکیں۔

15.2 نظم (گرمی اور دیہاتی بازار: جوش)

15.2.1 جوشؔ کا تعارف:

جوش کا پورا نام شبیر حسن خان تھا پہلے شبیر تخلص کرتے تھے بعد میں جوش اختیار کر لیا۔ 1898 میں ملیح آباد، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام بشیر احمد خان تھا وہ بھی شاعر تھے اور ان کا تخلص بشیر تھا اسی طرح ان کے دادا محمد احمد خان اور پردادا فقیر محمد خان بھی اچھے شاعر تھے۔ محمد احمد خان کا تخلص احمد اور فقیر محمد خان کا تخلص گویاؔ تھا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جوش کو شعر و شاعری کا شوق گھر کے ماحول سے ہی ملا تھا۔ جوش کا گھرانہ دولت مند گھرانہ تھا ان کے اجداد جاگیردار تھے۔ ان کے پردادا فقیر محمد خان لکھنؤ کے نواب غازی الدین حیدر کے دور حکومت میں بڑے بڑے عہدے پر فائز رہے۔ وہ پچیس ہزار سواروں کے رسالدار اور مالیات کے وزیر تھے۔ نواب نے انھیں گولہ گنج میں زمین کا ایک بڑا حصہ دے رکھا تھا جبکہ غازی الدین حیدر نے ہی فقیر محمد خان کے والد محمد بلند خان کو ملیح آباد کا ایک محلہ کنول ہار دے چکے تھے۔

جوش ایک جاگیر دار گھرانے سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اس کے بعد سیتاپور کے فرنچ ایچ اسکول میں داخلہ لے لیا وہاں پڑھنے گئے لیکن ابھی ڈیڑھ سال ہی ہوئے تھے کہ ان کے والد نے واپس بلا لیا اور لکھنؤ کے حسین آباد اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ 1912 میں وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج، علی گڑھ پڑھنے گئے لیکن شرارتوں کی وجہ نکال دیئے گئے۔ واپس لکھنؤ آ گئے اور مرزا ہادی رسوا سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد جوش نے آگرہ کے پیٹرز کالج سے سینئر کیمبرج کی تعلیم مکمل کی۔ ابھی وہ آگرہ میں زیر تعلیم ہی تھے کہ 1916 میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد وہ واپس ملیح آباد آ گئے لیکن مطالعہ کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

جوش نو برس کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے حالانکہ ان کے والد نہیں چاہتے تھے کہ ان کا بچہ ابھی سے شعر و شاعری میں مصروف ہو جائے۔ ان کے منع کرنے کے باوجود بھی جوش چوری چھپے شاعری کرتے رہے۔ انھوں نے اردو ادب کو بہترین نظمیں دی ہیں جو ان کی شہرت کا باعث ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے غزل، مرثیہ، سلام، گیت اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں پہلا مجموعہ " روح ادب " کے نام 1921 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر و نشاط، حرف و حکایت، رامش و رنگ، سنبل و سلاسل، سرود و خروش اور سموم و صبا وغیرہ شائع ہوئے۔ اردو ادب میں ان کے خود نوشت کی بھی بڑی اہمیت ہے جو " یادوں کی برات " کے نام سے ہے۔

جوش کو وراثت میں اگرچہ بہت زیادہ دولت ملی تھی لیکن وہ اسے سنبھال نہیں سکے۔ اس لیے انھیں بعد میں معاشی مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ 1924 میں وہ حیدرآباد گئے وہاں جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں مترجم کے طور پر کچھ عرصہ کام کیا۔ پھر واپس دلی آ کر رسالہ " کلیم " جاری کیا۔ کچھ دنوں تک فلموں کے لیے لکھنے کا بھی کام کیا۔ آزادی کے بعد پنڈت نہرو کے کہنے پر رسالہ " آجکل " کے مدیر بنائے گئے۔ آل انڈیا ریڈیو کے ایڈوائزر کے طور پر بھی خدمات انجام دی۔ اس کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں امید کے مطابق پذیرائی نہیں ہوئی اور طرح طرح کی پریشانیوں سے جوجھتے رہے۔ بالآخر 1982 میں اسلام آباد میں انتقال کر گئے۔

جوش کی شاعری کے کئی پہلو ہیں جن میں ان کی انقلابی شاعری، فطرت نگاری اور منظر نگاری اہم پہلو ہیں۔ وہ انگریزوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ مجاہدین آزادی کے اندر ہمت و حوصلہ پیدا کیا۔ انھوں نے وطن کی آزادی کے موضوع پر بہت ساری نظمیں لکھی ہیں۔ جن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے، شکست زنداں کا خواب، بھوکا ہندوستان اور دعوت انقلاب جیسی کئی نظمیں بہت مشہور ہوئیں۔ جوش کو فطرت سے بھی خاص لگاو تھا سورج کے نکلنے اور ڈوبنے کا منظر انھیں بہت اچھا لگتا تھا۔ جب وہ کسی چیز کی منظر کشی کرتے تھے تو لفظوں کے ذریعہ ایسا منظر پیش کرتے تھے جیسے ہم حقیقت میں کھڑے ہو کر اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ان مناظر کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی بیان کرتے تھے۔ اس کی ایک واضح مثال نصاب میں شامل نظم " گرمی اور دیہاتی بازار " بھی ہے۔

15.2.2 نظم " گرمی اور دیہاتی بازار " :

دوپہر،بازار کا دن ،گاؤں کی خلقت کا شور
خون کی پیاسی شعاعیں،رُوح فرسا لو کا زور
آگ کی رو، کاروبار زندگی کا پیچ و تاب
تُند شعلے ،سرخ ذرے،گرم جھونکے آفتاب
شور، ہلچل، غلغلہ، ہیجان، لو،گرمی، غبار
بیل،گھوڑے، بکریاں، بھیڑیں قطار اندر قطار
مکھیوں کی بھنبھناہٹ،گڑ کی بو،مرچوں کی دھانس
خربزے، آلو، کھلی،گیہوں، کدو،تربوز، گھانس
دھوپ کی شدت،ہوا کی یورشیں،گرمی کی رو
کملیوں پر سرخ چانول،ٹاٹ کے ٹکڑوں پہ جو
گرم ذروں کے شدائد ،جھکڑوں کی سختیاں
جھکڑوں میں کھانستے بوڑھوں کی چلموں کا دھواں
ماؤں کے کاندھے پہ بچے ،گردنیں ڈالے ہوئے
بھوک کی آنکھوں کے تارے،پیاس کے پالے ہوئے
بام و در لرزے ہوئے،خورشید کے آفات سے
ہر نفس،اک آنچ سی اٹھتی ہوئی ذرات سے
مرد و زن گردش میں ،چیلوں کی صدا سنتے ہوئے
چلچلاتی دھوپ کی رو میں چنے بھنتے ہوئے
میان سے موسم کی تیغ بے اماں نکلی ہوئی
پیاس سے انسان و حیواں کی زباں نکلی ہوئی
لو کے مارے بام و در کی روح گھبرائی ہوئی
دوستوں کی شکل پر بیگانگی چھائی ہوئی
یوں شعاعیں سایۂ اشجار سے چھنتی ہوئی
بے مروت کی سپاٹ آنکھوں کی جیسے روشنی
آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود وکرم
ہر روش پر چڑچڑاپن ،ہر صدا میں بے رخی

ہر جگر بھنتا ہوا، ہر کھوپڑی پکتی ہوئی
سر پہ کافر دھوپ، جیسے روح پر عکس گناہ
تیز کرنیں، جیسے بوڑھے سود خواروں کی نگاہ

15.2.3 نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کی تشریح:

یہ نظم ان کے مجموعہ کلام '' شعلہ و شبنم '' میں شامل ہے۔ اس مختصر سی نظم میں جوش نے دیہاتی بازار کی بہت عمدہ تصویر کشی کی ہے اور اس کی پوری جزئیات کو بہترین الفاظ و تراکیب کے ذریعہ بیان کر دیا ہے۔ اس نظم کی خاص خوبی منظر نگاری ہے۔ اس نظم میں جوش نے دیہات کے بازار میں گرمی کی شدت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس منظر نگاری کی ابتدا اس طرح سے ہوتی ہے کہ بازار کا دن ہے اور دوپہر کا وقت ہے اور اس بازار میں لوگوں کی بھیڑ شور و غل مچا رہی ہے۔ اس پر مزید گرمی کی شدت ہے سورج کی شعاعیں اتنی گرم ہیں جیسے وہ خون کی پیاسی ہوں اور '' روح فرسا'' یعنی انتہائی اذیت ناک ہوائیں گرم لُو کی شکل میں چل رہی ہیں۔ سورج کی تپش اتنی زیادہ ہیں کہ وہاں کے ذرات سرخ دکھائی دینے لگے ہیں اور ہوائیں شعلے کی مانند چل رہی ہیں جس سے غلغلہ اور ہیجان برپا ہے۔ ہر طرف شور و غل مچا، گرد و غبار اڑ رہے، گرمی بہت شدید ہے، بھیڑیں اور بکریاں قطار در قطار کھڑی ہیں۔ مرچ کی دھانس اور گڑ کی بو پھیلی ہوئی ہے، مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ خربوزے، آلو، گیہوں، تربوز وغیرہ اشیا فروخت کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔ تیز دھوپ میں گرم ہوائیں جیسے یلغار کر رہی ہوں اور ٹاٹ کے ٹکڑوں پر جو اور کملیوں میں سرخ دھان رکھے ہوئے ہیں۔ گرم اور تیز ہوائیں اپنے ساتھ دھول اور ذرات کو اڑا رہی ہیں اور اس پر چلموں کا دھواں فضا کو مزید ناگوار بنا رہا ہے۔ غربت کی ماری ہوئی مائیں بھوک اور پیاس سے نڈھال بچوں کو اپنے کاندھے پر ڈالے ہوئے ہیں۔ سورج کی تپش اور گرمی سے انسان اور جانور تو بے حال ہیں ہی آس پاس کی چیزیں بھی اتنی گرم ہو گئی ہیں کہ جیسے ان سے آنچ آ رہی ہو۔ لوگ بازار میں گھوم رہے ہیں، سامان بیچنے والے بچے صدا لگا رہے ہیں لیکن دھوپ اتنی سخت ہے کہ پورا منظر ایسا لگ رہا ہے جیسے چنے بھنے جا رہے ہوں۔

شاعر گرمی کی شدت کو بیان کرتے ہوئے مبالغہ آمیز لہجے میں کہتا ہے کہ بازار میں انسانوں اور جانوروں کی زبانیں پیاس سے باہر نکلی ہوئی ہیں گویا کہ موسم کی میان سے تیغ بے اماں نکلی ہوئی ہے۔ لو کی وجہ سے ذرہ ذرہ آگ کی طرح گرم ہو گیا ہے اور دوست و احباب ایک دوسرے سے محبت سے ملنے کے بجائے بیگانہ ہو گئے ہیں، لوگ خود میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ انھیں دوسروں کا خیال تک نہیں آتا ہے ایک نفسی نفسی کی کیفیت بنی ہوئی ہے۔ درختوں کے نیچے بھی سکون نہیں ہے وہاں سورج کی شعاعیں پتوں سے چھن چھن کر ایسے آ رہی ہیں جیسے بے مروت اور سپاٹ آنکھوں کی روشنی ہو۔

آسماں پر ابر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کا رم
نشّے میں ممسک کا جیسے وعدۂ جود و کرم

اس شعر میں '' ابر'' کے معنیٰ بادل ''رم'' کے معنی بھاگنا اور '' ممسک'' سے مراد بخیل ہے۔ اب پورے شعر یعنی دونوں مصرعوں کا مفہوم یہ ہو گا کہ آسمان میں بادل کے ٹکڑے یوں ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں جیسے کہ وہ کسی بخیل اور کنجوس کی سخاوت کے وعدے ہوں۔ جس طرح سے ایک بخیل آدمی مال و دولت ہوتے ہوئے بھی جود و کرم نہیں کرتا ہے اسی طرح سے یہ بادل ہیں جنھیں

دیکھنے سے تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی بارش برسائیں گے لیکن نہیں برساتے جبکہ لوگوں کو شدت سے بارش کا انتظار ہے۔

ہر روش پر چڑچڑاپن ،ہر صدا میں بے رخی
ہر جگر بھنتا ہوا،ہر کھوپڑی پکتی ہوئی

گرمی کی شدت کی وجہ سے لوگوں کے رویے میں چڑچڑاپن آگیا ہے اور ہر کوئی بے رخی سے بات کر رہا ہے۔" جگر بھنتا ہوا" سے مراد یہ ہے کہ دھوپ، گرمی اور اس پورے منظر کی وجہ سے لوگوں میں بے چینی بہت زیادہ ہے وہ اس قدر پریشان ہیں جیسے کہ وہ جھلسا دینے والی گرمی اور تپش باہر نہ ہو بلکہ ان کے جسم کے اندر ہو،"جگر بھنتا ہوا اور کھوپڑی پکتی ہوئی" یہ دونوں تراکیب بے چینی کی انتہا کو بتانے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔اسی طرح اس نظم کے آخری شعر میں دھوپ کی شدت کو" عکس گناہ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور دھوپ کی تیز کرنوں کو کسی "بوڑھے سود خوار کی نگاہ" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس سے مراد دھوپ کی شدید تپش کو ظاہر کرنا ہے جس میں ہمدردی یا رحم دلی کا شائبہ تک نہیں ہے۔

15.2.4 مشکل الفاظ:

ثروت مند	دولت مند	Wealthy, rich
خلقت	مخلوق،انسان اور دوسرے جانور	Creation, creatures, humans and animals
یورشیں	حملے	Attacks, raids
خورشید	سورج	Sun
بام ودر	گھر کے در و دیوار / چھت اور دروازہ	Roof and walls / House structure
اشجار	شجر کی جمع،درخت	Trees (plural of Shajar)
شعاعیں	شعاع کی جمع،روشنی / کرنیں	Rays, beams of light
صدا	آواز	Sound, voice
مردوزن	مرد اور عورت	Male and female
گردش	چکر لگانا / کسی چیز کا گھومنا	Rotation, turning, movement in a circle
نفس	دم / سانس / جاندار	Breath, life, respiration
تند شعلے	آگ کی تیز لپٹ	Fierce flames, strong fire
احباب	حبیب کی جمع،ایک سے زیادہ دوست	Friends, companions (plural of Habib)
اشیا	شے کی جمع،چیزیں	Things, objects (plural of Shai)
فروخت کرنا	بیچنا	To sell
یلغار	حملہ،دھاوا	Attack, raid, assault

تپش	گرمی / سورج کی تمازت	Heat, warmth, intensity of the sun
ممسک	کنجوس، بخیل	Stingy, miserly
تیغ	تلوار / شمشیر	Sword, blade

15.2.5 مشقیں:

مشق 1: صحیح جملوں کے سامنے (✓) اور غلط کے آگے (✗) کا نشان لگائیں۔

1۔ جوش کا پورا نام شبیر حسن خان تھا۔ ( )

2۔ جوش کا شعری مجموعہ "روح ادب" ہے۔ ( )

3۔ جوش رسالہ "آج کل" کے مالک تھے۔ ( )

4۔ "شعلہ و شبنم" جوش کا شعری مجموعہ ہے۔ ( )

5۔ "گرمی اور دیہاتی بازار" فیض احمد فیض کی نظم ہے۔ ( )

مشق 2: نیچے دیے گئے جمع الفاظ کے واحد بتایے۔

1۔ اشجار : ....

2۔ احباب : ....

3۔ صدائیں : ....

4۔ شعاعیں : ....

5۔ اشیا : ....

6۔ کرنیں : ....

15.3 اقتباس (رات اور ریل، مجاز)

15.3.1 مجاز کا تعارف:

مجاز کا پورا نام اسرار الحق ہے۔ ضلع بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں 1911 میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آگرہ چلے گئے۔ آگرہ کے مشہور کالج سینٹ جانس سے انٹر میڈیٹ کیا۔ اس وقت آگرہ علم و ادب کا گہوارہ تھا شعر و شاعری کے چرچے ہر طرف تھے۔ فانی بدایونی، مجاز کے ہمسایہ تھے، معین احسن جذبی اور آل احمد سرور بھی اسی سینٹ جانس کالج میں پڑھتے تھے۔ اردو کے دوسرے ادبا بھی آگرہ میں موجود تھے۔ جن سے ان کا ملنا جلنا تھا اور ان کی صحبتیں میسر تھیں۔ ظاہر ہے اس کے اثرات ان کی شخصیت پر بھی پڑے اور وہ پورے طور پر شعر و شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ گویا مجاز کی ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز آگرہ سے ہوتا ہے جب کہ اس وقت ان کی عمر بیس سال کے آس پاس تھی۔

انٹر میڈیٹ کے بعد وہ علی گڑھ آ گئے اور 1936 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے۔ مکمل کیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھی جا چکی تھے اور ادب کی محفلوں میں اس کے چرچے ہونے لگے تھے۔یونیورسٹی کے طلبا اور شعرا میں اس تحریک کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔اسرار الحق مجاز بھی ترقی پسند نظریات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔پھر جیسے جیسے ان کے خیالات میں پختگی آتی گئی وہ حسن و عشق کے بجائے وطن کی آزادی اور وطن سے محبت کی بات کرنے لگے۔غریبوں،کسانوں اور مزدوروں کے حق کی آواز اٹھانے لگے۔انگریزوں کے استحصالی نظام اور ان کے ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کرنے لگے۔ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ " آہنگ" کے نام سے 1938 میں شائع ہوا۔اس کا تیسرا ایڈیشن کچھ اضافے کے ساتھ " شب تاب" اور چوتھا ایڈیشن " سازنو" کے نام سے شائع ہوا۔

مجاز نے عملی زندگی کی شروعات آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے کی تھی اس کے بعد انھوں نے کچھ دنوں تک محکمہ اطلاعات، ممبئی میں بھی کام کیا، لکھنؤ سے نکلنے والے رسالے" نیا ادب" کی ادارت کی، آخر میں وہ ہارڈنگ لائبریری، دہلی سے منسلک ہو گئے تھے۔1955 میں ان کا انتقال ہوا۔

15.3.2 نظم "رات اور ریل":

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی جھومتی سیٹی بجاتی کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرود دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
جیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی
نونہالوں کو سناتی میٹھی میٹھی لوریاں
نازنینوں کو سنہرے خواب دکھلاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی گنگناتی جھومتی
سر خوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب جھلکاتی ہوئی

جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی
منتشر کر کے فضا میں جا بجا چنگاریاں
دامن موج ہوا میں پھول برساتی ہوئی
تیز تر ہوتی ہوئی منزل بمنزل دم بہ دم
رفتہ رفتہ اپنا اصلی روپ دکھلاتی ہوئی
سینۂ کہسار پر چڑھتی ہوئی بے اختیار
ایک ناگن جس طرح مستی میں لہراتی ہوئی
اک ستارہ ٹوٹ کر جیسے رواں ہو عرش سے
رفعت کہسار سے میدان میں آتی ہوئی
اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
رعشہ بر اندام کرتی انجم شب تاب کو
آشیاں میں طائر وحشی کو چونکاتی ہوئی
یاد آ جائے پرانے دیوتاؤں کا جلال
ان قیامت خیزیوں کے ساتھ بل کھاتی ہوئی
ایک رخش بے عناں کی برق رفتاری کے ساتھ
خندقوں کو پھاندتی ٹیلوں سے کتراتی ہوئی
مرغ زاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کی مانند منڈلاتی ہوئی
اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغ طور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزل مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی
چھیڑتی اک وجد کے عالم میں ساز سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی
رینگتی مڑتی مچلتی تلملاتی ہانپتی

اپنے دل کی آتش پنہاں کو بھڑکاتی ہوئی
خودبخود روٹھی ہوئی بپھری ہوئی بکھری ہوئی
شور پیہم سے دل گیتی کو دھڑکاتی ہوئی
پل پہ دریا کے دما دم کوندتی للکارتی
اپنی اس طوفان انگیزی پہ اتراتی ہوئی
پیش کرتی بیچ ندی میں چراغاں کا سماں
ساحلوں پر ریت کے ذروں کو چمکاتی ہوئی
منہ میں گھستی ہے سرنگوں کے یکایک دوڑ کر
دندناتی چیختی چنگھاڑتی گاتی ہوئی
آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھراتی ہوئی
تیزیِ رفتار کے سکے جماتی جا بجا
دشت و در میں زندگی کی لہر دوڑاتی ہوئی
ڈال کر گزرے مناظر پر اندھیرے کا نقاب
اک نیا منظر نظر کے سامنے لاتی ہوئی
صفحۂ دل سے مٹاتی عہد ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی
ڈالتی بے حس چٹانوں پر حقارت کی نظر
کوہ پر ہنستی فلک کو آنکھ دکھلاتی ہوئی
دامن تاریکیٔ شب کی اڑاتی دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
زد میں کوئی چیز آ جائے تو اس کو پیس کر
ارتقائے زندگی کے راز بتلاتی ہوئی
زعم میں پیشانی صحرا پہ ٹھوکر مارتی
پھر سبک رفتاریوں کے ناز دکھلاتی ہوئی

ایک سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے
ایک طوفانی گرج کے ساتھ ڈراتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
ہر قدم پر توپ کی سی گھن گرج کے ساتھ ساتھ
گولیوں کی سنسناہٹ کی صدا آتی ہوئی
وہ ہوا میں سیکڑوں جنگی دہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جاں فزا آواز لہراتی ہوئی
الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف و خطر
شاعر آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

15.3.3 نظم ''رات اور ریل'' کا خلاصہ:

نظم '' رات اور ریل'' مجاز کی مشہور نظم ہے جس میں ان کا فنی کمال عروج پر نظر آتا ہے۔اس دور کی شاعری میں اس طرح کے موضوعات پر نظمیں لکھنے کا عام رواج نہیں تھا مجاز نے اپنی اس نظم سے سب ہی کو حیران کر دیا تھا۔ایک تخلیق کار کا مشاہدہ یا چیزوں کو دیکھنے کی صلاحیت عام لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ٹرین کو چلتے ہوئے تو ہم سبھی لوگوں نے بارہا دیکھا ہے لیکن اس ٹرین کے حوالے سے انسان کی ذہانت اور عظمت کا اعتراف کرنے کا خیال ذہن میں نہیں آتا ہے۔شاعر نے نہ صرف ٹرین کی ایجاد کے گن گائے ہیں بلکہ اس کی ایک ایک حرکت، غیر معمولی قوت اور سفر میں آنے والے مناظر کو خوبصورت لفظوں کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے جیسے ہم خود اس ٹرین میں سوار ہوں یا یہ کہ ٹرین کو چلتے ہوئے بہت قریب سے دیکھ رہے ہوں۔شاعر ٹرین کے منظر اور اس کی کیفیت کو ایک نظم کے ذریعہ پیش کرنے میں اسی لیے کامیاب ہو سکا ہے کیوں کہ اس کا مشاہدہ بہت گہرا ہے وہ چیزوں پر یوں ہی سرسری نظر ڈال کر آگے نہیں بڑھ جاتا ہے۔وہ چیزوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس پر غور و فکر بھی کرتا ہے۔پھر بہترین الفاظ اور تشبیہ و استعارہ کے ذریعہ اس کی تصویر بنا دیتا ہے۔

یہ نظم ان کے مجموعہ کلام '' آہنگ ''میں شامل ہے۔یہ نظم 1933 میں لکھی گئی ہے۔ نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے کہ ٹرین رات کے اندھیرے میں زیر لب گنگناتے ہوئے چل پڑتی ہے۔یہاں پہلے شعر کے دوسرے مصرعے میں '' نیم شب '' کے معنٰی آدھی رات ہے اور زیر لب گنگنانے سے مراد یہ ہے کہ وہ دھیرے دھیرے آواز کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔وہ ڈگمگاتی اور جھومتی ہوئے آگے بڑھتی ہے، ٹھنڈی ہوا کھاتے ہوئے وادی کہسار یعنی پہاڑوں کے راستوں سے ہوتے چلی جاتی ہے۔جب وہ تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہے تو ہوا کے تیز جھونکوں سے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کہیں بارش ہو رہی ہو اور وہاں سے سرد اور تر و تازہ ہوائیں آرہی ہوں۔ٹرین کے چلنے کے وقت اس کے انجن اور پہیوں سے جو آوازیں آرہی تھیں اس کے بارے میں شاعر کہتا ہے کہ اس کی آواز مترنم اور مدھر تھی جیسے سمندری لہروں سے اٹھنے والی آوازیں آرہی ہوں۔اسی طرح وہ ہر موڑ پر اس قدر ناز و ادا سے مڑتی تھی جیسے کہ کوئی نئی نویلی دلہن ہو جسے

اپنی ہی اداوں پر شرم آ جاتی ہو۔ رات کی تاریکی میں جب ٹرین کی روشنی پٹریوں پر پڑتی تھی تو اس کی روشنی اتنی تیز اور دلکش ہوتی تھی جیسے کہ پٹریوں پر موتی بکھیر دیے گئے ہوں۔

دھیرے دھیرے ٹرین کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے اور وہ اپنی اصل و طاقت و قوت کا مظاہرہ کرنے لگی۔ جس طرح ایک ناگن مستی میں لہراتی ہے اسی طرح یہ ٹرین بھی پہاڑی علاقوں میں بے خوف و خطر چلتی چلی جاتی تھی۔ پہاڑوں کی اونچائی سے جب ہموار زمین کی طرف آتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے کہ آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ کر نیچے کی طرف آ رہا ہو۔ وہ بگولے کی طرح میدان میں دوڑ رہی تھی اور جب اپنے تیز رفتاری کے ساتھ جنگلوں میں چلتی تھی تو ایسا لگتا تھا جیسے کہ آندھی آ گئی ہو۔ جب یہ پہاڑی علاقوں میں چلتی تھی تو ایسا لگتا تھا کہ آبشار بہہ رہے ہیں اور جب یہ بیاباں یا چٹیل میدان میں چلتی تھی تو چراغ طور کا نظارہ پیش کرتی تھی۔ اسی تیز رفتاری کے ساتھ جب مڑتی تھی تو اس میں دیوتاوں جیسا جلال نظر آتا تھا۔ غرض وہ اپنی منزل مقصود کی طرف پورے زور و شور سے بڑھ رہی تھی۔

ٹرین جب چل رہی تھی تو اس پر بے خودی کی کیفیت طاری تھی جیسے وجد کی حالت میں ہو اور انجن سے جو دھواں نکل رہا تھا تو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ غیض و غضب میں منھ سے آگ برسا رہی ہو۔ وہ پل کے دریا پر بے خوف و خطر چلی جا رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی طاقت و قوت پر اترا رہی ہو۔ سرنگوں کے اندر جو راستے ہوتے ہیں اس میں چیختی چلاتی اور گنگناتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی لگتا تھا کہ وہ رات کی تاریکی کی ہیبت سے گھبرا بھی رہی ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ آگے کی طرف منزل تلاش کرتے ہوئے چلی جا رہی تھی۔ وہ جس جگہ سے گزرتی وہاں اپنے تیز رفتاری کے نقوش چھوڑ جاتی تھی جس سے دریاوں اور جنگلوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ اس میں جو لوگ سوار تھے انہیں بھی خوب لطف آتا تھا اس لیے کہ انھیں ایک کے بعد ایک نیا منظر دکھائی دیتا تھا۔ ایک ایک منظر ایسے گزر رہے تھے جیسے کہ وہ کوئی ماضی کے نقوش ہوں اور حال و مستقبل کے مناظر نہایت دلکش لگنے لگتے تھے۔ چٹانوں کے درمیان سے اس طمطراق کے ساتھ گزر رہی تھی جیسے کہ وہ چٹانوں کو حقیر سمجھ رہی ہو اور پہاڑوں پر ہنس رہی ہو، وہ اسی طرح آسمان سے نظریں ملائے ہوئے شان و شوکت کے ساتھ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ رات کی تاریکی بھی اس کے رفتار پر اثر انداز نہ ہو سکی چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اس کے باوجود بھی وہ آگے بڑھتی رہی۔ اس کے سامنے اگر کوئی آ جاتا تھا تو اسے کچل کر رکھ دیتی تھی۔ وہ ایک سرکش فوج کی طرح آگے ہی بڑھتے جا رہی تھی اور اس کی آواز ایک طوفانی گرج کی طرح تھی۔ ٹرین کی ایک ایک حرکت میں بغاوت کا انداز دکھ رہا تھا وہ دریا، پہاڑ اور جنگل کے ہر راستے سے آسانی کے ساتھ بڑھی چلی جا رہی تھی اس ایجاد سے انسانی عظمت کی سربلندی نمایاں ہو رہی تھی۔ اس کمال کی ایجاد پر سر دھننے کو جی چاہ رہا تھا۔

15.3.4 مشکل الفاظ:

شب	رات	Night
رفعت	بلندی، اونچائی	Height, elevation, loftiness
کہسار	پہاڑ، پہاڑی علاقہ	Mountain, hilly region
منسلک	ساتھ لگا یا ہوا، جڑا ہوا	Attached, connected
منتشر	بکھرا ہوا، تتّر بتّر	Scattered, dispersed

طمطراق	شان و شوکت / دھوم دھام	Grandeur, pomp, splendor
آشیاں	گھر، گھونسلا	Nest, home
تاریکی	اندھیرا / سیاہی	Darkness
انجم	ستارے / تارے	Stars
خندقوں	گڑھے / کھائیاں، واحد خندق	Ditches, trenches
مرغزار	ہری گھاس، سبزہ زار	Green meadow, grassy field
آبشار	جھرنا، وہ جگہ جہاں پانی بلندی سے نیچے گرتا ہو	Waterfall
بیاباں	ریگستان / جنگل	Desert, wilderness
ساحل	سمندر یا دریا کا کنارہ	Shore, coast
عہد ماضی	گزرا ہوا زمانہ	Past era, bygone time
حقارت	ذلت / نفرت	Disdain, contempt
آشکار	نمایاں / فاش	Clear, evident, obvious
عظمت	برتری / شان و شوکت	Greatness, grandeur
ایجاد	کسی نئی چیز کی تخلیق	Creation, invention
سرکش	باغی / نافرمان	Rebellious, defiant
مترنم	گانے والا / سریلا	Melodious, tuneful
مشاہدہ	دیکھنا / معائنہ	Observation, seeing, inspection
غیض و غضب	انتہا کا غصہ	Extreme anger, wrath

15.3.5 مشقیں:

مشق 1: تعارف اور خلاصے کی مدد سے خالی جگہ کو پر کیجیے۔

1۔ مجاز نے..انٹر میڈیٹ کی تعلیم مکمل کی تھی۔

2۔ مجاز نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے...کیا تھا۔

3۔ مجاز ترقی پسند تحریک..تھے۔

4۔ فانی بدایونی..ہمسایہ تھے۔

5۔ پھر چلی ریل...ہوئی۔

مشق 2 : نیچے دیے گئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کیجیے۔

1۔ ماضی ....

2۔ رفتہ رفتہ ....

3۔ شب ....

4۔ ایجاد ....

5۔ مجاز ....

15.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- جوش کا پورا نام شبیر حسن خان تھا۔ پہلے شبیر تخلص کرتے تھے بعد میں جوش اختیار کر لیا۔ جوش 1898 میں ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ انھیں ادب میں شاعر انقلاب اور شاعر فطرت کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔
- جوش کا پہلا شعری مجموعہ "روح ادب" کے نام سے 1921 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے شعری مجموعے نقش و نگار، شعلہ و شبنم، فکر ونشاط، حرف وحکایت، رامش ورنگ، سنبل وسلاسل، سرود وخروش اور سموم وصبا کے نام سے شائع ہوئے۔
- جوش کی مشہور نظم "گرمی اور دیہاتی بازار" کے متن کا مطالعہ کیا۔ یہ نظم ان کے مجموعہ کلام "شعلہ وشبنم" میں شامل ہے۔ جس میں جوش نے دیہاتی بازار کی بہت عمدہ تصویر کھینچی ہے۔
- اس اکائی میں دوسری نظم "رات اور ریل" کا بھی آپ نے مطالعہ کیا۔ یہ نظم مجاز کی ہے۔ ان کا اصل نام اسرار الحق ہے۔ یہ ضلع بارہ بنکی کے قصبہ ردولی میں 1911 میں پیدا ہوئے۔
- مجاز فکری طور پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ مجاز نے 1936 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ کیا تھا۔ وہ زمانہ طالب علمی سے ہی شعر وشاعری کرنے لگے تھے۔ علی گڑھ پہنچنے کے بعد ان کے شوق شاعری میں مزید پختگی آئی۔ ترقی پسند تحریک کا قیام بھی اسی زمانے میں ہوا۔ جس کے چرچے ادبی حلقوں میں بہت تیزی کے ساتھ ہونے لگے۔ اسرار الحق مجاز بھی اس تحریک کے نظریات سے متاثرت ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور پورے طور پر اس کے ہمنوا بن گئے۔
- مجاز کا پہلا شعری مجموعہ "آہنگ" کے نام سے 1938 میں شائع ہوا۔ اس بعد اس کے دوسرے ایڈیشن "شب تاب" اور "ساز نو" کے نام سے شائع ہوئے۔ مجاز کا انتقال 1955 میں ہوا۔

15.5 نمونہ امتحانی سوالات

15.5.1 معروضی سوالات:

1۔ "گرمی اور دیہاتی بازار" کس کی نظم ہے؟

(a) عرش ملسیانی (b) حالی (c) جوش (d) مجاز

2۔ جوش کا پورا نام کیا ہے؟

(a) فقیر محمد خاں (b)داؤد خان (c)شبیر حسن خان (d)اسرار الحق

3۔ یادوں کی برات کس کی خود نوشت سوانح ہے؟

(b) جوش (b)فیض (c)علی سردار جعفری (d)جذبی

4۔ نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کے پہلے مصرعے میں ''خلقت کا شور'' سے کیا مراد ہے؟

(a) جانوروں کا شور (b)مردوں کا شور (c)سامان بیچنے والوں کا شور (d) انسان اور جانور سبھی کا

5۔ مجاز کس کا تخلص ہے؟

(b) محمد احمد (b)شبیر حسن خاں (c)اسرار حسین (d)اسرار الحق

6۔ '' آہنگ'' کس کا شعری مجموعہ ہے ؟

(b) مجاز (b)ذوق (c)جوش (d)آتش

7- نظم '' رات اور ریل'' میں ریل نے سفر کا آغاز کب کیا؟

(b) دوپہر میں (b) آدھی رات میں (c) صبح میں (d) سہ پہر میں

8۔ ریل'' آندھیوں کا زور'' کب دکھلاتی ہے؟

(b) جب پل پر چلتی ہے (b)جب وادیوں میں چلتی ہے (c)جب جنگلوں میں چلتی ہے(d)جب پہاڑوں پر چلتی ہے

9۔ ٹرین ریت کے ذروں کو کب چمکاتی ہے؟

(b) جب ساحلوں پر چلتی ہے (b)جب صحراوں میں چلتی ہے(c)جب مرغزاروں میں چلتی ہے(d)بلندی پر چلتی ہے

10۔ نظم '' رات اور ریل'' کب لکھی گئی؟

(a) 1933 (b) 1900 (c) 1950 (d)1910

15.5.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1۔ جوش ملیح آبادی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔

2۔ اسرار الحق مجاز کا تعارف پیش کیجیے۔

3۔ جوش کو کتنے القابات سے یاد کیا جاتا ہے، وضاحت کیجے۔

4۔ جوش اور مجاز کا کس ادبی تحریک سے تعلق تھا، بیان کیجے۔

5۔ جوش کے شعری مجموعوں کے نام بتایے؟

15.5.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1۔ نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کا خلاصہ پیش کیجیے۔

2۔ نظم ''رات اور ریل'' کے حوالے سے ریل کے گزرنے کے مقامات اور گزرنے کی کیفیت بیان کیجیے۔

3۔ نظم ''گرمی اور دیہاتی بازار'' کی منظر نگاری پر روشنی ڈالیے۔

15.5.1 کے جوابات:

D	(v)	D	(iv)	A	(iii)	C	(ii)	C	(i)
A	(x)	A	(ix)	A	(viii)	B	(vii)	A	(vi)

اکائی16: رباعیات

انیس، اکبر، جوش، امجد

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 رباعی کی تعریف

16.3 انیس کی رباعیات اور ان کی تشریح

16.3.1 مشکل الفاظ

16.4 اکبر کی رباعیات اور ان کی تشریح

16.4.1 مشکل الفاظ

16.5 امجد کی رباعیات اور ان کی تشریح

16.5.1 مشکل الفاظ

16.6 جوش کی رباعیات اور ان کی تشریح

16.6.1 مشکل الفاظ

16.7 اکتسابی نتائج

16.8 مشقیں

16.9 نمونۂ امتحانی سوالات

16.0 تمہید

رباعی تمام اصناف میں سب سے مختصر صنف ہے مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں عام طور پر اخلاقی نکات، فلسفیانہ، متصوفانہ یا اصلاحی مضامین باندھے جاتے ہیں۔ دکنی شعرا نے رباعی کے دامن کو بہت وسیع کیا اور مختلف موضوعات پر رباعیاں کہی ہیں۔ اردو میں رباعی لکھنے والے شعرا کی فہرست طویل ہے۔ میر حسن، انیس، دبیر، حسرت، امجد حیدر آبادی، جگت موہن لال رواں، جوش، یگانہ، فراق اور گوہر جلالی کے بعد مظفر حنفی، کمار پاشی، مخمور سعیدی، باقر مہدی اور سلطان اختر نے اچھی رباعیاں کہی ہیں۔

اس اکائی میں ہم اردو کے چار اہم اور مشہور رباعی گو شعرا، میر انیس، اکبر الہ آبادی، امجد حیدر آبادی اور جوش ملیح آبادی کی دو دو منتخب رباعیاں تشریح کے ساتھ پیش کریں گے۔

16.1 مقاصد

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

- صنف رباعی کا تعارف کر سکیں۔
- انیس، اکبر، امجد اور جوش کی رباعیوں کی تشریح کر سکیں۔
- اپنی پسند کے شعرا کی رباعیاں زبانی یاد کر سکیں۔

16.2 رباعی کی تعریف

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ رباعی چوں کہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اس کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ غزل مختلف بحروں میں کہی جا سکتی ہے لیکن رباعی کے لیے صرف ایک بحر مختص ہے جو ہزج کہلاتی ہے۔ رباعی اس بحر کے 24 اوزان ہی میں کہی جا سکتی ہے۔ رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور تیسرے مصرعے کا قافیہ جداگانہ ہوتا ہے۔ رباعی کو ہیت کے اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (1) خصی (2) غیر خصی۔

خصی: وہ رباعی ہوتی ہے جس میں پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔

غیر خصی: اس میں چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں یعنی تیسرے مصرعے کا قافیہ علاحدہ نہیں ہوتا۔ خصی رباعیاں اردو میں زیادہ مقبول ہوئیں، ان میں تیسرا مصرعہ ایک جھٹکہ سا پیدا کرتا ہے اور اس سے ذہن چونک پڑتا ہے جس کی وجہ سے رباعی کے مجموعی تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔

رباعی مختصر ترین صنف شاعری ہے اس کے چار مصرعوں میں خیال کی ابتدا اس کی نشو و نما اور اختتام کے تمام مراحل طے ہو جاتے ہیں۔ رباعی کا تیسرا مصرع رباعی کے مضمون کو کلائمکس تک لے جاتا ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرعہ اس اعتبار سے اہم ہوتا ہے کہ اس میں خیال کا لب لباب موجود ہوتا ہے۔

16.3 انیس کی رباعیات اور ان کی تشریح

16.3.1 انیس کا تعارف:

میر ببر علی انیس 1802ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر مستحسن خلیق اور دادا میر حسن دہلوی جو میر ضاحک کے صاحبزادے تھے۔ انیس کا سارا خاندان علم و فضل کا حامل تھا۔ انیس کے والد فیض آباد سے امجد علی شاہ کے عہد میں لکھنؤ آئے۔ اس زمانے میں میر ضمیر مرثیہ گوئی میں میر خلیق کے ہم رتبہ تھے۔ انہی کے مشورے پر انیس نے مرثیہ گوئی کی جانب خصوصی توجہ کی۔ ابتدا میں غزل گوئی کا شوق رکھتے تھے۔ صرف و نحو، معنی و بیان، عروض و منطق، تاریخ اسلام، طب اور رمل کا مطالعہ کیا تھا۔ گھوڑ سواری، فن سپہ گری، شمشیر زنی اور بنوٹ میں مہارت حاصل تھی۔

انیس کی شہرت ان کے لافانی مرثیوں کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے مرثیوں کے علاوہ رباعیوں کا بھی خاصا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی رباعیوں میں حزنیہ مضامین کے علاوہ فلسفیانہ اور فکری موضوعات بھی ملتے ہیں۔ عام مضامین مثلاً دنیا کی بے ثباتی، فقر و قناعت اور موت و حیات کو بھی اپنے شاعرانہ حسن بیان کے ذریعہ پر اثر اور دل کش بنا دیا ہے۔ حسن بیان، ندرت تخیل اور خیال کی تازگی

ان کی رباعیوں کی خصوصیات ہیں۔ انیس نے بہت سی رباعیاں، حمد، نعت، منقبت خصوصاً اہل بیت اطہار کے بارے میں کہی ہیں۔ ان رباعیوں میں صدق دلی، والہانہ محبت اور گہری عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انیس کے یہاں رثائی رباعیات بھی ملتی ہیں۔

16.3.2 رباعی (1)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
ہر گل کی زباں پہ ، گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تیری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

تشریح: اس رباعی کا موضوع حمد وثنا ہے۔ اس میں شاعر نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تخلیق کائنات کا مقصد ہی تلاش حق ہے۔ اس کائنات میں جو گہما گہمی ہے وہ دراصل حمد باری تعالیٰ کی جستجو کی نشان دہی کرتی ہے۔ یعنی حیات و کائنات کے وجود کا دارو مدار ذات باری تعالیٰ پر ہے۔ دنیا کی ہر صدا، حمد خداوندی ہے۔ نطق اور اس کی صلاحیت خدا کی ہی ودیعت کردہ ہے۔ اشجار طیور اور سب جان دار اپنی اپنی زبان میں خدا کی ہی حمد وثنا کرتے ہیں۔ ذات باری تعالیٰ نہ صرف مرکز وجود ہے بلکہ سارے مظاہر قدرت اس کی ذات کی نیر نگیاں ہیں۔ وہی ہر شئے میں پنہاں اور جلوہ نما ہے۔ چناں چہ رباعی کے چوتھے مصرعے میں انیس نے اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ جس طرح پھول میں خوشبو سمائی ہوتی ہے خوشبو کی شناخت پھول کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس کائنات میں خدا کا وجود سمایا ہوا ہے۔ اس کے بغیر دنیا کی کوئی شئے معنی نہیں رکھتی۔

16.3.3 رباعی (2)

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے
ہستی کو حباب آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھلا
جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

تشریح: اس رباعی میں زندگی کی بے ثباتی کا بڑے دل نشیں انداز میں اظہار کیا ہے۔ انسان کا وجود ہی فانی نہیں بلکہ زندگی میں اس کی مختلف حالتیں اور مدارج حیات بھی مستقل قائم نہیں رہتے۔ طفلی یعنی بچپن گزر جاتا ہے تو شباب کی رنگینی کا دور آتا ہے لیکن یہ دور بھی جلد ختم ہو جاتا ہے اور بڑھاپا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ انسان اس سچائی سے غافل رہتا ہے کہ ہستی مثل حباب آب ہے جو چند لمحوں تک ابھر کر پھٹ جاتا ہے اور جب انسان پر موت کی نیند طاری ہوتی ہے تو راز کھلتا ہے کہ اس دنیا کے مختصر عرصہ زندگی میں جو کچھ بھی دیکھا وہ محض ایک خواب تھا۔

16.3.1 مشکل الفاظ:

لب لباب	نچوڑ، خلاصہ	Essence, gist, summary
گلشن	باغ، چمن	Garden, flower-garden
صبا	ہوا	Breeze, morning wind
صدا	آواز	Voice, sound, echo
نطق	بولنے کی طاقت، گویائی	Speech, oratory, power of speaking
طیور	پرندے	Birds
نیرنگیاں	نیرنگی کی جمع، کرشمے، تبدیلی	Wonders, marvels, tricks
طفلی	بچپن	Childhood, childish
حباب آب	پانی کا بلبلہ	Water bubble
مدارج	درجے، رتبہ	Degrees, ranks, levels
عقدہ	راز	Knot, secret, problem

16.4 اکبر کی رباعیات اور ان کی تشریح

16.4.1 اکبر الہ آبادی کا تعارف:

اکبر حسین نام اور اکبر تخلص تھا۔ 16 نومبر 1846ء کو موضع بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ زمانے کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر مشن اسکول میں داخل ہوئے۔ ایک سال ہوا تھا کہ 1857ء کا ہنگامہ ہو گیا اور ان کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ مگر یہ گھر پر برابر پڑھتے رہے۔ عربی فارسی کے ساتھ انگریزی کا بھی مطالعہ کیا۔ 1857ء کے بعد عام مسلمانوں کی طرح اکبر کے خاندان کو بھی سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے اکبر کو ملازمت کی فکر ہوئی۔ انھوں نے اپنی ملازمت کی ابتدا عرضی نویسی سے کی۔ محلے کے ایک وکیل سے محرری سیکھتے رہے پھر ان کو سر رشتہ داری کی نوکری مل گئی۔ ملازمت کے ساتھ ساتھ وہ برابر اپنے طور پر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ان کو قانون سے خاص لگاؤ تھا عدالت میں مسل خواں ہوئے پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے وکیل بنے۔ ترقی کر کے منصف اور اس کے بعد جج کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ 1898ء میں ان کو عدالتی خدمات کے عوض خان بہادر کا خطاب ملا۔

اکبر اردو کے ایک نام ور شاعر ہیں ان کی شہرت زیادہ تر ان کے طنزیہ اور ظریفانہ کلام کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے غزلوں، نظموں کے ساتھ ساتھ صنف رباعی کا بھی ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیوں میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، قومی ،اصلاحی اور اخلاقی مضامین داخل کر کے رباعی کے میدان کو وسیع کیا ہے۔ ان کی رباعیاں طنز و ظرافت کی چاشنی کے باعث اردو رباعیوں میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مغربی تمدن کے ہر پہلو کو انھوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

16.4.2 رباعی (1)

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زوروزر ہے بے کار
مذہب نہیں تو آدمیت بھی نہیں

تشریح: اکبر کی یہ رباعی زمانے پر ایک تفکر آمیز تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ مذہب کا جو تصور ان کے یہاں ملتا ہے وہ ان اعلیٰ اقدار پر مبنی ہے جو آدمی کو آدمیت کا پیرہن عطا کرتا ہے۔ دنیاوی علوم، طاقت، دولت اور حکمرانی انسان کو بہ ظاہر طاقت ور ضرور بناتے ہیں لیکن انسان کو اس کے اشرف و اعلیٰ معیار سے پستی کی طرف بھی لے جاتے ہیں۔ مذہب انسان کے لیے علم واقتدار کے حصول میں رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ علم اور قوت کو صحیح طور پر برتنا سکھاتا ہے۔ دنیاوی علوم کا حصول اکبر کے دور میں ملت کے لیے لازمی ہو گیا تھا اور یہ رجحان اس قدر قوی ہو گیا تھا کہ اس نے دنیاوی علوم اور مذہب کے درمیان ایک تصادم کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اکبر نظریاتی اعتبار سے دنیاوی علوم کے حصول کو برا نہیں سمجھتے تھے لیکن مذہب کو نظر انداز کرنا ان کے نزدیک انسانیت کو خیر باد کرنے کے برابر ہے۔

16.4.3 رباعی (2)

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر جو چاہیں تہمت دھر دیں
بچتے رہو ان کی تیزیوں سے ، اکبر
تم کیا ہو ، خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

تشریح: اس رباعی میں مغربی تہذیب اور نظریات پر طنز کیا گیا ہے کہتے ہیں یورپ والے اس قدر چالاک ہیں کہ اپنی چالاکی سے جس بات کا چاہیں لوگوں کو یقین دلا دیں۔ ان کی چالاکی اور عیاری سے ڈرنا چاہیے۔ ہر طرف ان کا بول بالا ہے ان کا راج ہے۔ جس پر جو چاہیں الزام رکھ دیں۔ جس کو چاہیں لوگوں کی نظروں سے گرا دیں جسے چاہیں چڑھا دیں۔ یہ انسانوں کو کٹھ پتلی کی طرح نچاتے رہتے ہیں۔ انسانوں کا تو ذکر کیا ہے انھوں نے تو خدا کو بھی تین حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہاں اکبر نے عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کی طرف اشارہ کیا ہے۔

16.4.1 مشکل الفاظ:

محرری	منشی گیری، لکھنے کا پیشہ	Clerical work, writing profession
سررشتہ داری	میر منشی، پیش کاری	Chief clerk, assistant in writing work
ظریفانہ	مزاح کا پہلو لیے ہوئے، ظرافت والا	Witty, humorous, having a facet of wit
زر	سونا	Gold
عیاری	مکاری، چالاکی	Cunning, slyness, trickery
پیرہن	کپڑا، کرتا	Garment, clothing

اشرف	بہت زیادہ شریف، اعلیٰ نسب والا	Very noble, of high lineage
اعلیٰ	بلند	High, superior
تہمت	الزام	Accusation, Allegation

16.5 امجد کی رباعیات اور ان کی تشریح

16.5.1 امجد حیدر آبادی کا تعارف:

سید امجد حسین نام تھا۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صوفی سید رحیم علی بن سید کریم حسین ایک متقی اور پرہیز گار بزرگ تھے۔ جب امجد چالیس دن کے ہوئے تو ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور امجد کی پرورش ان کی والدہ صوفیہ بیگم نے کی۔ وہ ایک نیک، مذہبی اور پرہیز گار خاتون تھیں۔ عام رواج کے مطابق امجد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی پھر انھوں نے حیدر آباد کی درس گاہ جامعہ نظامیہ میں چھے سال تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کیا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہو گئی۔ شادی کے دو سال بعد امجد بنگلور چلے گئے اور وہاں پیشہ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ لیکن جلد ہی حیدر آباد واپس آ گئے۔ اور مدرسہ دارالعلوم میں استاد مقرر ہوئے۔ چند برس بعد وہ صدر محاسبی (اکاؤنٹنٹ جنرل) کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے مددگار صدر محاسب (ڈپٹی اکاؤنٹینٹ جنرل) کے عہدہ پر پہنچ کر وظیفہ پر سبک دوش ہوئے۔

اسی دوران ایک بھیانک واقعہ رونما ہوا جس نے ان کی زندگی کو رنج والم سے بھر دیا۔ 1908ء میں حیدر آباد کی موسیٰ ندی میں طغیانی آئی۔ شہر کا ایک بڑا حصہ سیلاب کی نظر ہو گیا۔ امجد ندی کے قرب وجوار میں ہی رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی طغیانی کی زد میں آ گیا اور نہ صرف مال و اسباب تباہ ہو گیا بلکہ ان کی والدہ، بیوی اور چار سالہ بچی اعظم النساء اس طغیانی کی نذر ہو گئیں۔ اس حادثے نے ان کے ذہن پر بہت برا اثر ڈالا۔

امجد رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ خود ایک بلند پایہ صوفی اور خدا رسیدہ انسان تھے اس لیے ان کی رباعیوں میں روحانی جذبات عارفانہ کیفیات، اور اخلاقی اقدار کا پر خلوص اور فن کارانہ اظہار ملتا ہے۔ ان کی رباعیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مضامین کو سادہ اور سہل زبان میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی متعدد رباعیوں میں قرآنی آیات کی تشریح کی گئی ہے۔

16.5.2 رباعی (1)

ہر چیز مسبّب سبب سے مانگو
منت سے، خوشامد سے، ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

تشریح: امجد نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ قاری کو توحید اور اخلاق کی تعلیم دے کر اس کی کردار سازی کی کوشش کی ہے۔ وہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے قائل نہیں تھے۔ اس رباعی میں وہ نہایت سادگی سے تلقین کرتے ہیں کہ کس سے اور کس طرح مانگنا چاہیے۔

چناں چہ کہتے ہیں کہ انسان کو چاہیے کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے کیوں کہ دینے والا تو پروردگار ہے اس سے مانگنا چاہیے۔ لیکن مانگنے کے بھی کچھ طریقے ہوتے ہیں خدا کو غرور ناپسند ہے اس سے مانگتے وقت ہمیشہ عاجزی انکساری اور خوشامد کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ ہم اس کے بندے ہیں وہ ہمارا خالق ہے اس لیے غیر کے آگے ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں۔

16.5.3 رباعی (2)

کم ظرف اگر دولت و زور پاتا ہے
مانند حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات پر فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

تشریح: اس رباعی میں ایک عام بات کو سیدھی سادی زبان میں روزمرہ کے مشاہدہ کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر نا اہل انسان جب ترقی کرتا ہے یا کوئی نعمت حاصل کر لیتا ہے تو مغرور ہو جاتا ہے اور اپنی اصلیت یا حقیقت کو یکسر بھلا بیٹھتا ہے۔ امجد نے اس خیال کی وضاحت کے لیے دو پر اثر تشبیہیں حباب اور تنکے استعمال کیے ہیں۔ حباب کا وقتی طور پر ابھرنا اور تنکے کا ہوا میں اڑنا ان کے کھوکھلے پن کی علامت ہے۔ پہاڑ ہوا کی آندھی سے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا لیکن کم ظرف انسان تنکے کی طرح معمولی سی ترقی سے بھی اڑنے لگتا ہے۔

16.5.1 مشکل الفاظ:

طغیانی	سیلاب، باڑھ، بہت زیادہ بارش ہونے کے سبب دریا کا چڑھاؤ	Flood, Deluge, Excessive Rise of Water
عارفانہ کیفیات	صوفیوں اور عارفوں جیسی کیفیت، حالت	Mystical Or Sufi-Like States/Experiences
مسبب	جو سبب بنے	The One who causes, Cause
منت	مراد، دعائیں مانگنا	Favor, Prayer Request, Supplication
سہل	آسان	Easy, Simple
قاری	پڑھنے والا	Reader, Reciter (Especially of the Quran)
تلقین	کوئی چیز بتانا، سمجھانا	Instruction, Teaching, Explaining Something
خسیس	کنجوس	Stingy, Miserly

16.6 جوش کی رباعیات اور ان کی تشریح

شبیر حسین خاں نام اور تخلص جوش۔ اردو کے ایک قادر الکلام اور پر گو شاعر ہیں۔ ملیح آباد میں 1896ء میں پیدا ہوئے۔ فقیر محمد خاں گویا ان کے پر دادا تھے۔ جوش کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سینٹ پیٹر آگرہ میں تعلیم کے مراحل پورے کیے۔ سینئیر کیمبرج تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور ذاتی مطالعہ کی وجہ سے ان کی علمیت میں اضافہ ہوا۔ 9 سال کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کیا۔ جوش کے والد نے انھیں عزیز لکھنوی کا شاگرد بنا دیا۔ 1924ء میں جوش تلاش معاش کے سلسلے میں حیدر آباد آئے اور مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اپنی ذاتی صلاحیت سے جوش نے شہزادگان تک رسائی حاصل کی اور ملازمت بھی حاصل ہوگئی۔ حیدر آباد میں جوش کی شاعری کا دور بڑا یادگار رہا۔ انھیں دارالترجمہ میں ملازمت کا موقع ملا اور ان کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا۔ 1924ء سے 1934ء تک جوش کی زندگی حیدر آباد میں بسر ہوئی۔ اس کے بعد دہلی گئے اور رسالہ کلیم جاری کیا۔ فلمی گیت لکھے۔ سرکاری رسالے آج کل کے مدیر اعلیٰ کے طور پر کام کیا۔ 1956ء میں پاکستان چلے گئے۔ 22 فروری 1982 ء کو اسلام آباد پاکستان میں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔

جوش بیک وقت غزل اور نظم کے شاعر ہیں اور شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے حُسن و عشق کے ساتھ ساتھ انقلابی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ سرمایہ داروں اور مذہب کے اجارہ داروں کے خلاف آواز اٹھائی اور کسانوں اور غریبوں کی حمایت کی ہے۔ جوش نے مختلف موضوعات پر سینکڑوں کی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ یہ رباعیاں فلسفہ، اخلاق، سماجی خرابیوں، مفلسی و غریبی، رومان اور مناظر فطرت جیسے موضوعات پر کی گئیں ہیں۔

16.6.1 رباعی (1)

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا ہنس کے چمن میں بابا
یہ ایک تبسّم بھی کسے ملتا ہے

تشریح: اس رباعی کا بنیادی موضوع بے ثباتی دنیا ہے۔ جوش پھول کی کلی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اے کلی تیری زندگی پر مجھے بہت ترس آتا ہے۔ بس ایک تبسّم کے لیے تیرا وجود ہے۔ یعنی پھول کھلتا ہے اور کچھ دیر بعد مرجھا کر اس کی پتیاں بکھر جاتی ہیں۔ کلی کا جواب بڑا معنی خیز ہے۔ وہ کہتی ہے کہ یہ سچ ہے کہ پھول کی زندگی بس ایک تبسّم تک ہے یعنی پھول کھلتے ہی مرجھا جاتا ہے مگر چمن میں یہ ایک تبسم بھی ہر کلی کو میسر نہیں ہوتا۔

16.6.2 رباعی (2)

ہے صبح افق سے جگمگانے والی
وعدے پہ ان کے مسکرانے والی
جا ، پچھلے پہر کے چاند، ان سے کہہ دے
اب رات ہے دو گھڑی میں جانے والی

تشریح: جوشؔ کی رباعیوں کا ایک اہم موضوع حسن و عشق بھی ہے۔ یہ رباعی ان کے عشقیہ کلام کی نمائندگی کرتی ہے۔ محبوب نے رات کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ شاعر نے تمام رات انتظار میں بسر کی۔ رات کا آخری پہر شروع ہو چکا کچھ دیر بعد صبح کے آثار نمایاں ہونے لگیں گے۔ افق پر ہلکی سی روشنی مسکرائے گی گویا صبح بھی محبوب کے وعدہ پر طنزیہ تبسم کرے گی۔ پچھلی رات کا چاند اب غروب ہونا چاہتا ہے۔ شاعر چاند کے ذریعہ محبوب کو یہ پیام بھیجتا ہے کہ اب تمہارے وعدے کی مدت ختم ہو رہی ہے اور چند لمحوں میں رات ختم ہونے والی ہے۔

16.6.1 مشکل الفاظ:

قادرالکلام	جو بات کرنے پر قدرت رکھتا ہو	Eloquent, able to speak effectively
غنچہ	کلی	Bud (flower bud)
بے ثباتی	جس میں ثبات نہ پایا جائے، فنا ہونے والی چیز	Instability, lack of steadiness
افق	آسمان	Horizon
موضوع	اصل شے، وضع کیا گیا	Topic, subject
تبسم	مسکرانا	Smile
دو گھڑی	دو ساعت، گھنٹہ	Two hours, a short period of time

16.7 اکتسابی نتائج

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ نے درج ذیل باتیں سیکھیں:

- رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔
- رباعی کا پہلا دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور تیسرے مصرعے کا قافیہ جداگانہ ہوتا ہے۔
- رباعی کو ہیئت کے اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔(1) خصی (2) غیر خصی۔
- میر ببر علی انیس 1802ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ اور 1874 میں لکھنؤ میں وفات پائی۔
- انیس نے مرثیوں کے علاوہ رباعیوں کا بھی خاصا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی رباعیوں میں حزنیہ مضامین کے علاوہ فلسفیانہ اور فکری موضوعات بھی ملتے ہیں۔
- انیس نے بہت سی رباعیاں، حمد، نعت، منقبت خصوصاً اہل بیت اطہار کے بارے میں کہی ہیں۔ ان رباعیوں میں صدق دلی، والہانہ محبت اور گہری عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انیس کے یہاں رثائی رباعیات بھی ملتی ہیں۔
- اکبر الہ آبادی کا پورا نام اکبر حسین اور اکبر تخلص تھا۔ 16 نومبر 1846ء کو موضع بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔
- زمانے کے دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر مشن اسکول میں داخل ہوئے۔

- اکبر اردو کے ایک نام ور شاعر ہیں ان کی شہرت زیادہ تر ان کے طنزیہ اور ظریفانہ کلام کی وجہ سے ہے۔ انھوں نے غزلوں، نظموں کے ساتھ ساتھ صنف رباعی کا بھی ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔
- اکبر الہ آبادی نے اپنی رباعیوں میں سیاسی، سماجی، معاشرتی، قومی، اصلاحی اور اخلاقی مضامین داخل کرکے رباعی کے میدان کو وسیع کیا ہے۔
- ان کی رباعیاں طنز و ظرافت کی چاشنی کے باعث اردو رباعیوں میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مغربی تمدن کے ہر پہلو کو انھوں نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔
- سید امجد حسین حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد صوفی سید رحیم علی بن سید کریم حسین تھے۔
- امجد رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو شاعری میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں روحانی جذبات، عارفانہ کیفیات، اور اخلاقی اقدار کا پر خلوص اور فن کارانہ اظہار ملتا ہے۔
- امجد کی رباعیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مضامین کو سادہ اور سہل زبان میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی متعدد رباعیوں میں قرآنی آیات کی تشریح کی گئی ہے۔
- جوش ملیح آبادی کا نام شبیر حسین خاں اور تخلص جوش تھا۔ اردو کے ایک قادر الکلام اور مشہور شاعر ہیں۔ ملیح آباد میں 1896ء میں پیدا ہوئے۔
- 1924ء میں جوشؔ تلاش معاش کے سلسلے میں حیدر آباد آئے اور دارالترجمہ میں ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد دہلی گئے اور رسالہ کلیم جاری کیا۔ فلمی گیت لکھے۔ سرکاری رسالے آج کل کے مدیر اعلی کے طور پر کام کیا۔ 1956ء میں پاکستان چلے گئے۔ 22 فروری 1982ء کو اسلام آباد پاکستان میں انتقال ہوا اور وہیں سپرد خاک ہوئے۔
- جوشؔ غزل اور نظم کے شاعر ہیں۔ انھیں شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے حُسن و عشق کے ساتھ ساتھ انقلابی موضوعات پر بھی نظمیں کہی ہیں۔
- جوش نے سرمایہ داروں اور مذہب کے اجارہ داروں کے خلاف آواز اٹھائی اور کسانوں اور غریبوں کی حمایت کی ہے۔
- جوش نے مختلف موضوعات پر سینکڑوں کی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ یہ رباعیاں فلسفہ، اخلاق، سماجی خرابیوں، مفلسی و غریبی، رومان اور مناظر فطرت جیسے موضوعات پر کہی گئیں ہیں۔

16.8 مشقیں

مشق 1: نیچے دی گئی عبارت کو پڑھ کر سوالوں کے جواب دیجیے۔

"رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ رباعی چوں کہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اس کو اس نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ غزل مختلف بحروں میں کہی جاسکتی ہے لیکن رباعی کے لیے صرف ایک بحر مختص ہے جو ہرج کہلاتی ہے۔ رباعی کا پہلا دوسرا اور

چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے اور تیسرے مصرعے کا قافیہ جداگانہ ہوتا ہے۔ رباعی کو ہیت کے اعتبار سے دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔(1) خصی (2) غیر خصی۔"

I. رباعی کس زبان کا لفظ ہے؟ (   )

II. رباعی کے لغوی معنی کیا ہیں؟ (   )

III. رباعی کے لیے کون سی بحر مخصوص ہے؟ (   )

IV. رباعی کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ (   )

مشق 2: درج ذیل رباعی کے قافیوں کی نشاندہی کیجیے اور ان کے معنیٰ لکھیے۔

گر جیب میں زر نہیں تو راحت بھی نہیں
بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زوروزر ہے بے کار
مذہب نہیں تو آدمیت بھی نہیں

....

....

....

....

....

....

16.9 نمونۂ امتحانی سوالات

16.9.1 معروضی سوالات:

(1) رباعی کس زبان کا لفظ ہے؟

(a) سنسکرت (b) فارسی (c) ترکی (d) عربی

(2) رباعی کے لغوی معنی کیا ہیں؟

(a) چار (b) سات (c) پانچ (d) دس

(3) رباعی کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟

(a) آٹھ (b) دس (c) بارہ (d) دو

(4) میر انیس کہاں پیدا ہوئے؟

(a) دہلی (b) فیض آباد (c) لکھنؤ (d) آگرہ

(5) انیس کا میر حسن سے کیا رشتہ تھا؟

(a) نانا، نواسہ (b) باپ، بیٹا (c) دادا، پوتا (d) چچا، بھتیجا

(6) گلشن کے کیا معنی ہیں؟

(a) جنگل (b) صحرا (c) چمن (d) بیابان

(7) اکبر الہ آبادی کا پورا نام کیا ہے؟

(a) اکبر حسین (b) ذاکر حسین (c) مجاور حسین (d) عارف حسین

(8) امجد حیدرآبادی کہاں کے رہنے والے تھے؟

(a) گلبرگہ (b) اورنگ آباد (c) دہلی (d) حیدرآباد

(9) امجد حیدرآبادی کی رباعیات کا موضوع کیا ہے؟

(a) سیرت و اخلاق (b) عشق و محبت (c) دنیا کی محبت (d) زر و دولت

(10) کس شاعر کو شاعر شباب اور شاعر انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

(a) انیسؔ (b) جوشؔ (c) اکبر (d) امجد

16.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات:

1. نصاب میں شامل اپنی پسند کے کسی ایک شاعر کی ایک رباعی کی تشریح کیجیے۔
2. اکبر نے اپنی رباعیوں میں کن باتوں کو بیان کیا ہے؟ لکھیے۔
3. امجد حیدرآبادی کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔
4. انیس کے حالات زندگی پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. درج ذیل الفاظ کے معنی لکھتے ہوئے انھیں جملوں میں استعمال کیجیے۔

طفلی، گلشن، زر، عقدہ

16.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات:

1. اپنی پسند کے کسی ایک شاعر کی رباعیوں کی تشریح کیجیے۔
2. جوش کی رباعیوں کی خصوصیات کو بیان کیجیے۔
3. ان رباعیوں کی تشریح کیجیے۔

طفلی دیکھی شباب دیکھا ہم نے
ہستی کو حباب آب دیکھا ہم نے

جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کھلا
جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

ہر چیز مسبّب سبب سے مانگو
منت سے،خوشامد سے،ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندے ہو اگررب کے تورب سے مانگو

16.10.1 کے جوابات:

C	(v)	B	(iv)	D	(iii)	A	(ii)	D	(i)
B	(x)	A	(ix)	D	(viii)	A	(vii)	C	(vi)

نمونۂ امتحانی پرچہ

نشانات : ۷۰ Marks: 70　　　　وقت: 3 گھنٹے Time :3hours

ہدایات :

یہ پرچۂ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہیں۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں، جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ پُر کرنا / مختصر جواب والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہیں۔ Marks 1x10=10

2۔ حصہ دوم میں آٹھ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ Marks 5x6=30

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں، ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ Marks 3x10=30

حصہ اول

سوال:1

(i) قصیدہ "ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی" کس نے لکھا ہے؟

(a) سوداؔ　(b) ذوقؔ　(c) غالبؔ　(d) مومنؔ

(ii) قصیدے میں کم سے کم کتنے اشعار ہوتے ہیں؟

(a) دس　(b) بارہ　(c) پندرہ　(d) اٹھارہ

(iii) حضرت علی اصغرؑ کا سن کیا تھا؟

(a) ایک سال　(b) چار مہینہ　(c) تین مہینہ　(d) چھے مہینہ

(iv) مرزا شوق کا نام کیا تھا؟

(a) احمد حسین　(b) تفضل حسین　(c) تصدق حسین　(d) اکبر حسین

(v) فراق گورکھپوری الہ آباد یونیورسٹی میں کس شعبے میں لکچر رتھے؟

(a) انگریزی　(b) اردو　(c) ہندی　(d) فارسی

(vii) ناصر کاظمی کی والدہ کا کیا نام تھا؟

(a) منیری محمدی (b) کنیزہ محمدی (c) فریدہ محمدی (d) زرینہ محمدی

(vii) میر حسن نے کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟

(a) بارہ (b) دس (c) آٹھ (d) پانچ

(viii) "گرمی اور دیہاتی بازار" کس کی نظم ہے؟

(a) عرش ملسیانی (b) جوشؔ (c) حالیؔ (d) مجازؔ

(ix) میر انیسؔ کہاں پیدا ہوئے؟

(a) لکھنؤ (b) فیض آباد (c) دہلی (d) آگرہ

(x) رباعی کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟

(a) آٹھ (b) دس (c) بارہ (d) دو

حصہ دوم

2۔ ذوق کی قصیدہ گوئی کو بیان کیجیے۔

3۔ ناصر کاظمی کے بارے میں کیا جانتے ہیں۔ چند جملے لکھیے۔

4۔ علامہ اقبال کی شاعری کو کتنے دور میں بانٹا گیا ہے لکھیے۔

5۔ نظم "ملاقات" کے چند بندوں کی تشریح کیجیے۔

6۔ صنف مرثیے کے بارے میں لکھیے۔

7۔ ذیل کے بند کی تشریح کیجئے۔

(1)

کیا سن تھا تیر کھاتے ہی بچہ دہل گیا
سوکھے گلے سے خون کا دریا ابل گیا
تڑپا جو شہ کے ہاتھوں پہ تو منکا ڈھل گیا
ٹوپی گری زمین پہ اور دم نکل گیا
ننھی کلائیوں میں تشنج سے بل پڑے
ہچکی جو آئی منھ سے انگوٹھے نکل پڑے

8۔ میر کے قیام لکھنؤ پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

9۔ حسرت کی شاعرانہ خصوصیات پر مختصر نوٹ لکھیے۔

حصہ سوم

10۔ مرزا شوق کے حالات زندگی پر مضمون قلم بند کیجیے۔

11۔ اختر شیرانی کی نظم نگاری کی خصوصیات پر ایک نوٹ لکھیے۔

12۔ مرثیے کی تعریف بیان کرتے ہوئے اس کے چند کرداروں کے نام بتائیے۔

13۔ "رات اور ریل" کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

14۔ امجد حیدرآبادی کی رباعی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

اہم نکات

اہم نکات